کتابیں پہلے شائع ہوچکی ہیں، اس نئی کتاب میں ان کے ذاتی حالات و سوانح کو زیادہ محنت و عرق ریزی سے جمع کیا گیا ہے، اس حیثیت سے یہ کتاب مفید ہے لیکن شاہ صاحب جیسی صاحب علم و کمال ہستی کی سوانحعمری کا حق انکی جدت و ابتکار، علمی افکار، فقہ و حدیث میں امتیازی کارناموں پر مبسوط تبصرہ کے بغیر پوری طرح ادا نہیں ہوسکتا غالباً مصنف کی یہ پہلی کتاب ہے اس لئے اس کا حشو و زوائد اور تکرار، جملوں میں بے ترتیبی تعبیر و طرز ادا میں خامی اور زبان کی غلطیاں ہیں مثلاً "مولانا معظم شاہ کو انور شاہ کی آئندہ تعلیم کے بارے میں یہ فیصلہ لینے میں کوئی زیادہ دقت محسوس نہ ہوئی ..... چنانچہ ۱۳۰۵ھ میں بعمر (۱۳ سال) "اطلبوا العلم ولو کان بالصین" کے اس عملی مصداق کو اپنے والد گرامی مولانا معظم صاحب نے ہزارہ روانہ کر دیا" (ص ۱۰) حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ مرحوم کا مدرسہ امینیہ دہلی کو زندہ رکھنے اور اسکو ترقی دینے میں قوم پر انکا احسان عظیم ہے۔" (ص ۱۰۱) ایسے لوگوں کو دیوبند کے طرز پر مدرسہ قائم کرکے اس کو بیداری عامہ اور اس کے سایہ میں انقلاب حالات کی جدوجہد کا فلسفہ سمجھانا بھینس کے آگے بین بجانے کے مترادف تھا، (ص ۱۱۵) اس زمانہ میں زاد سفر حج کے طور سے بہت تھوڑی رقم کافی ہوجاتی تھی، (ص ۱۱۹) بارہ مولہ کا مقام وادی کے دوسرے سب مقامات سے زیادہ موزوں مقام تھا (ص ۱۲۱) کہیں کہیں محاورے میں بھی غلطی ہے جیسے کانوں میں پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی (ص ۱۳۳) دیکھ بھال کا املا کسی جگہ بال، اور بلاد اعلیٰ کو مؤنث لکھا ہے، وجوہات، لوازمات، اکابرین، عمائدین اور سرحدات بے تکلف لکھ گئے ہیں، ایک جگہ مولانا عبدالماجد دریابادی کو مولانا تھانوی کا خلیفہ لکھا ہے، وہ مولانا مدنی سے بیعت تھے، مولانا احمد رضا خان بجنوری کے مضمون میں علامہ ابن حزم اور علامہ ابن تیمیہ وغیرہ کا ذکر نامناسب انداز میں کیا گیا ہے۔

"ض"

جلد ۱۲۱ ماہ صفر المظفر ۱۳۹۸ھ مطابق ماہ فروری ۱۹۷۸ء عدد ۲

مضامین

شذرات

کوئی تین برس ہوئے لکھنؤ سے تعمیر نامی ایک رسالہ نکلتا تھا، ۱۹۵۱ء میں اُس نے اپنے سرورق پر ایک تصویر شائع کی تھی، تلاطم خیز سمندر میں ایک ٹوٹی ہوئی کشتی بہتی چلی جا رہی ہے، اور ملاح غائب ہے، اس تصویر میں مصور نے اس وقت کے حالات کی عکاسی کی کوشش کی تھی، تقسیم ملک کے بعد مسلمانوں پر سراسیمگی طاری تھی، جس قیادت پر انھیں اعتماد تھا، اور جس کے سہارے وہ جد و جہد کر رہے تھے وہ رخصت ہو چکی تھی، اب وہ اپنے آپ کو بے یار و مددگار، اور فضا کو ناسازگار سمجھ رہے تھے، تصویر میں اسی ذہنی کیفیت کا اظہار کیا گیا تھا، لیکن درحقیقت حالات کی ناسازگاری ابھی اس حد تک نہیں پہنچی تھی، سمندر یقیناً تلاطم خیز تھا، کشتی بھی موجوں کی زد میں تھی، اور کسی قدر شکستہ بھی ہو چکی تھی لیکن ملاح ابھی بالکل ناپید نہیں ہوئے تھے، چند تجربہ کار اور باہمت شناوروں نے چپو ہاتھ میں لے لیا تھا، اور کشتی ملت کو بلاخیز موجوں سے بچا کر ساحل تک لانے کی کوشش کر رہے تھے،

اس موقع پر بے ساختہ مولانا حفظ الرحمن یاد آ رہے ہیں، وہ بڑی ہمت و بے باکی کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے اور طوفانِ حوادث کے سامنے سینہ سپر ہو گئے، اُن کی بہادرانہ جد و جہد نے ہوا کا رُخ پھیر دیا لیکن اُن کی وفات کے بعد پھر کوئی ایسا سر پھرا ملاح نظر نہ آیا اور تعمیر کی تصویر بالکل حسب حال ہو گئی، طوفان کی ہولناکی اور سمندر کی دہشت انگیزی روز افزوں تھی، لیکن ناخدا ناپید تھے، کشتی کے رخنے بڑھتے جا رہے تھے، اور دل لرز رہے تھے کہ ملت کا یہ تباہ حال سفینہ کہیں ڈوب نہ جائے،

ان حالات نے درد مندانِ ملت کو بے چین کر دیا، خطرہ کے شدید احساس نے منتشر افراد کو

اجتماع اور متفرق گروہوں کو اتحاد کا خیال دلایا، چھوٹی بڑی سب جماعتوں کے نمائندے لکھنؤ میں جمع ہوئے، اور غور و فکر کے بعد مجلس مشاورت کے نام سے مسلمانانِ ہند کی ایک مشترک جماعت بن گئی تاکہ سفینۂ ملت کو گرداب حوادث سے نکال کر سلامتی کے ساتھ ساحل مراد تک پہنچایا جائے اس مجلس کے قیام سے انتشار کی فضا بدلی، خوف و ہراس میں کمی ہوئی، اور لوگوں نے اطمینان کی سانس لی، اگر مختلف الخیال اشخاص اور گروہ اپنے اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر ملت کی حفاظت و سلامتی اور استحکام و ترقی کے لئے چند برس بھی جم کر جد و جہد کرتے رہتے، تو ملت کا ضعف دور ہو جاتا، اور ایک متحدہ طاقتور قوم وجود میں آ جاتی لیکن تھوڑے ہی عرصہ میں انتشار کی قوتوں نے پھر سر اٹھایا، افتراق کی ہوائیں چلنے لگیں اور متحدہ محاذ آپس ہی میں ٹکرا کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا،

کئی برس حالات کا رنگ یہی رہا، اور ملک کا انتشار برابر بڑھتا رہا، اس انتشار نے قوم کو بے حد نقصان پہنچایا، چاروں طرف سے مصائب و آلام کا ہجوم تھا، مگر کسی کے اندر تاب مقاومت نہ تھی، بالآخر گزشتہ سال پھر اتحاد و اتفاق کا خیال آیا اور مختلف جماعتوں نے متحدہ محاذ بنانے کے لئے دہلی میں ایک جلسہ منعقد کیا، اس ملی کنونشن سے ملت نے بڑی امیدیں قائم کیں، اور مجلس مشاورت کا گزشتہ دور نگاہوں کے سامنے آ گیا، لیکن "اے بسا آرزو کہ خاک شدہ" ابھی کنونشن کی روداد پورے طور پر اخباروں میں شائع بھی نہ ہونے پائی تھی کہ جماعتی اختلافات اور گروہی عصبیت کی خبریں آنے لگیں، بلکہ بعض ذمہ دار اور باخبر اصحاب کا بیان تو یہ ہے کہ اجلاس کے دوران ہی جماعتی عصبیت اور گروہی سیاست کی کارفرمائی نمایاں نظر آنے لگی تھی، ان حالات میں کسی مضبوط اور متحد محاذ کے قیام کا کیا سوال تھا، بس

نشستند و گفتند و برخاستند

ملی کنونشن کے اس انجام کے بعد اب کیا سوچا اور کیا کہا جائے، طبیعتیں ایسی افسردہ اور حوصلے اتنے پست ہوگئے ہیں کہ امید کا کوئی چراغ جلائے نہیں جلتا، بادِ مخالف کے جھونکے بدستور چل رہے ہیں، بلکہ روز بروز ان کی شدت بڑھتی جا رہی ہے، حال کو دیکھ کر مستقبل کا اندازہ دشوار نہیں ہے، لیکن ہنوز تخرب کی گرم بازاری ہے، طفل شیر خوار بھی منم رستم پہلوان کے نعرے لگا رہے ہیں، اور چھوٹی چھوٹی جماعتیں عالمگیریت کی مدعی ہیں، زمانہ کی مسلسل ٹھوکریں بھی ان لوگوں کو ہوش میں نہیں لا سکیں، وہ نہ اپنی صلاحیت کا اندازہ کرتے ہیں نہ حالات کو سمجھتے ہیں بس تمناؤں میں الجھے ہوئے خوش آیند خواب دیکھ رہے ہیں، اے کاش ان کی آنکھیں کھل جاتیں، اور وہ صورتِ حال کی سنگینی کو دیکھ کر اپنی صفوں کے اندر ربط و نظم پیدا کرتے،

دار المصنفین کے قیام کو ۶۴ سال گذر چکے ہیں، دو نسلیں اس کی خدمت کر کے رخصت ہو چکی ہیں، اور تیسری پابہ رکاب ہے، مولانا شبلیؒ نے اس کا جو لائحہ عمل مرتب کیا تھا وہ سرمایہ اور وسائل کی قلت کے باوجود بڑی حد تک پورا ہو چکا ہے، اور اب دائرہ کار کو مزید وسعت دینے کا ارادہ ہے، عہد رسالت سے دولتِ عثمانیہ تک تاریخ اسلام کی چھ جلدیں شائع کی جا چکی ہیں، اس سلسلہ کو عصر حاضر تک پہنچانے کے لئے مزید دو جلدوں کی ضرورت ہے، تاریخ ہند کے مختلف پہلوؤں پر کئی کتابیں لکھی جا چکی ہیں لیکن دو تین جلدوں میں ایک ایسی کتاب کی اشاعت بھی ضروری ہے جو صحت و جامعیت اور بے تعصبی و فراخدلی میں ممتاز ہو، عربی ادب کی جامع تاریخ کی تیاری بھی شروع ہے، ہمارے منصوبہ میں داخل پروگرام میں شامل ہے، احباب کا تقاضا ہے کہ ہم اپنی مطبوعات کے انگریزی ہندی اور عربی ترجمے بھی شائع کریں، اور عصری مسائل پر محققانہ کتابیں تیار کریں لیکن اس کیلئے ہمیں اپنے اشاعت میں بہت اضافہ کرنا پڑیگا، اور پریس کے انتظامات بھی وسیع کرنے ہوں گے اگر دار المصنفین کے ہمدرد ہمارے ساتھ تعاون کریں، اور ہماری مطبوعات اور معارف کی توسیع اشاعت کے لئے تھوڑی سی کوشش کریں تو یہ کارِ عظیم آسانی سے انجام پا سکتا ہے،

مقالات

اقبال کا فکری ارتقاء

از جناب مولانا عبد السلام خان رام پوری سابق پرنسپل مدرسہ عالیہ رام پور

(۳)

۱۹۱۳ء سے ۱۹۲۱ء تک

غالباً ۱۹۱۲ء میں ہی خودی پر فلسفیانہ غور و فکر کا آغاز ہو چکا تھا، مسلمانوں کا عام انفرادی اور اجتماعی تنزل تو اقبال کے سامنے تھا ہی، اسلامی تاریخ کے مطالعہ سے اُن پر یہ حقیقت بھی واضح ہو چکی تھی کہ اسلام دنیوی ترقی کے خلاف نہیں، قرونِ اولیٰ کے مسلمان جو اسلام کے سچے نمایندہ تھے، دنیوی ترقی کے لیے جد و جہد کو شجرِ ممنوعہ نہیں جانتے تھے، ان کی مذہبیت مانع ہونیکے بجائے اس ترقی میں معاون ہی ہوتی تھی، چنانچہ مسلمانوں کا دنیوی زوال عموماً اور برصغیر کے مسلمانوں کا تنزل خصوصاً اقبال کی توجہ کا سب سے بڑا موضوع تھا، خدا سے "شکوہ" میں ان کا خاص گلہ یہی تھا،

یہ شکایت نہیں؟ ہیں انکے خزانے معمور
نہیں محفل میں جنھیں بات بھی کرنے کا شعور

قہر تو یہ ہے کہ کافر کو ملیں حور و قصور
اور بیچارے مسلمان کو فقط وعدۂ حور

اب وہ الطاف نہیں ہم پہ عنایات نہیں
بات یہ کیا ہے کہ پہلی سی مدارات نہیں

کیوں مسلمانوں میں ہے دولتِ دنیا نایاب
تیری قدرت تو ہے وہ جسکی نہ حد ہے نہ حساب

تم جو چاہے تو اٹھے سینۂ صحرا سے حباب — رہرو دشت ہو سیلی زدۂ موج سراب

طعن اغیار ہے، رسوائی ہے، ناداری ہے — کیا ترے نام پہ مرنے کا عوض خواری ہے

بنی اغیار کی اب چاہنے والی دنیا — رہ گئی اپنے لئے ایک خیالی دنیا

ہم تو رخصت ہوئے اوروں نے سنبھالی دنیا — پھر نہ کہنا ہوئی توحید سے خالی دنیا

جہاں تک مذہبیت کا تعلق تھا، مسلمان دوسروں سے کمتر نہ تھے پھر اس تنزل کی وجہ کیا ہے، اقبال نے محسوس کیا کہ اس تنزل کی اصل وجہ ان کی ذوق عمل سے محرومی ہے، وحدت وجود کا وہ عوامی تصور جو ایرانی شعرا کی منظومات کی بدولت مسلمانوں کے دل و دماغ پر چھایا ہوا ہے، اس محرومی کا بڑا سبب ہے۔[1] اپنی ذات کو فنا کر کے باری تعالیٰ کی بقا میں اپنے آپ کو باقی یقین کرنا ہمارے روایتی تصوف کی غایت ہے۔ ظاہر ہے کہ انسانی سعادت کے اس تصور میں عالم آب و گل کے لیے جد و جہد کی بہت کم گنجایش ہے۔

یورپ میں ہندو اور نوفلاطونی تصوف کے ساتھ روایتی مسلم تصوف کا مغربی اثرات کی معیت میں گہرے مطالعہ نے اور وہ بھی عروج و زوال کی مسلم تاریخ کو سامنے رکھکر انھیں مسلم تصوف پر غیر اسلامی اثرات اور اُس کے یک طرفہ اُخروی میلانات سے واقف کرا دیا تھا، وہ یہ جان چکے تھے کہ انسانی جد و جہد کی اس غایت سے اسلام کو کوئی تعلق نہیں، اور نہ یہ تصور اسلامی ہے، انھوں نے محسوس کر لیا تھا کہ جتبک تصوف کے ان یک طرفہ میلانات پر اور اس انسانی غایت پر ضرب نہیں لگائی جائے گی مسلم معاشرہ میں اسلام کی مثبت روح بیدار نہ ہو گی۔[2]

انسانی "انا" یا شخصیت کی مستقل حقیقت پر جرمنی میں جو زور دیا گیا تھا، اور انگلستانی فلاسفہ نے اپنی فطری واقعیت پسندی کی بدولت اس پر اپنی جد و جہد کی بنیاد

[1] دیباچہ اسرار خودی ص ز
[2] اقبال نامہ اول ص ۳۵، ۳۶

رکھی تھی، اقبال کی نظروں میں تھی، وہ انکی ان تھک جد و جہد اور لوگوں کی انفرادی اور اجتماعی ترقی اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے،[1] چنانچہ اقبال کے خودی اور شخصیت پر زور دینے کی مثبت وجوہ تو تھیں ہی لیکن یہ ایک طرح سے روایتی تصوف کے خلاف احتجاج بھی تھا، شخصیت اور خودی کی نفی اور فنا کے بجائے اس کا اثبات اور اسکی بقا یہ اقبال کی فکر تھی جس کا آغاز غالباً ۱۹۱۲ء میں ہو چکا تھا اور وہ شخصیت کی ذاتی قدر و قیمت سے اور اس کے اس کردار سے جو وہ کسی جمعیت میں ہو کر ادا کرتی ہے، پوری طرح واقف تھے۔

خودی اور بے خودی یا شخصیت اور ملیت

جمعیت یا ملیت افراد اور شخصیتوں سے بنتی ہے، اگر افراد میں ترقی کا ولولہ، جد و جہد کی طرف میلان اور تعاون کا جذبہ نہو ایک دوسرے کی مدد سے اپنی کمیوں کو پورا کرنے مزاحمتوں کو دور کرنے اور زندگی کی شاہراہ کو ہموار کرنے کی خواہش نہو تو نہ افراد آگے بڑھ سکتے ہیں، اور نہ ملت وجود میں آسکتی ہے جب کہ ملت کا عروج، اقبال کی سب سے بڑی تمنا تھی۔ ملت اور اس کے عروج پر فکر کا تقاضا تھا کہ وہ شخصیت اور فرد پر گہری نظر ڈالتے، اُس کی حقیقت پر غور و خوض کرتے اُسکے اندرونی امکانات اور باطنی قوتوں کا جائزہ لیتے، شخصیت کے رخ سے کائنات کو دیکھتے، شخصیتوں کی کثرت محض اور ملت میں تفریق کرتے، ترکیبی روابط کی تفتیش کر کے ان کو وجود میں لانے اور مستحکم کرنے کے وسائل تلاش کرتے اور اس طرح اسرار خودی کو فاش اور رموز بے خودی کا انکشاف کرتے۔ اقبال کا اس عہد کا کلام خاص طور سے اسی غور و فکر کا منظوم نتیجہ ہے، خودی کی حقیقت، اس کی خصوصیات، زندگی سے اس کا تعلق اور اس کی بقا میں خودی کا کردار، خودی کے استحکام کے وسائل

[1] دیباچہ اسرار خودی ص ز

اور ضعف و اضمحلال کے اسباب، اس کے مختلف مراحل حیات پھر جماعت سے اس کا تعلق، اس کی اکائیوں کی کثرت سے اجتماعی وحدت کی تشکیل اور ملت کی تعمیر ملت نظم وضبط اور نظم وضبط کے اسباب اور دوسرے متعلقہ مسائل اس زمانے میں اقبال کی فکر کے خصوصی موضوعات ہیں،

عشق: عشق کی کائناتی اہمیت سے اقبال پہلے سے واقف تھے لیکن معشوق اور محبوب متعین اور مشخص نہ تھا، اب ایسا معشوق جس کے عشق سے ہماری خودی میں زندگی، پائندگی، سوز اور تابندگی پیدا ہوتی ہے، مشخص ہو چکا ہے۔

ہست معشوقے نہان اندر دلت   چشم اگر داری بیا بنمایمت
عاشقانِ او ز خوبان خوب تر   از حسینانِ جہان محبوب تر
دل ز عشقِ او توانا مے شود   خاک ہمدوش ثریا مے شود
خاک نجد از فیض او چالاک شد   آمد اندر وجد و بر افلاک شد

یہ محبوب جو مسلمان کے دل میں ہر وقت موجود رہتا ہے وہ آنحضرت ؐ کی ذات گرامی ہے:

در دل مسلم مقام مصطفیٰ است   آبروے ما ز نام مصطفیٰ است

اب تک دین کا جو تصور تھا وہ دنیا سے بالکل الگ تھلگ اور ممتاز تھا اس کا تقدس دنیوی آلودگیوں کو برداشت نہیں کرتا تھا، لیکن آنحضرت ؐ کی ذات

---

[1] نقطۂ نوری کہ نام او خودی است   زیر خاک ما شرار زندگی است
از محبت مے شود پایندہ تر   زندہ تر سوزندہ تر تابندہ تر
از محبت اشتعال جوہرش   ارتقاے ممکنات مضمرش
فطرت او آتش اندوزد ز عشق   عالم افروزی بیاموزد ز عشق

گرامی نے اس یک طرفہ تصور کو بدل ڈالا اور دین کی نئی طرح ڈالی!

در جہان آئین نو آغاز کرد   مسند اقوام پیشین در نورد

آپ کے دین کا تقدس دنیا کو آغوش میں لیکر دنیا کو بھی مقدس بنا دیتا ہے وہ دنیا کو دین کی کنجی سے کھولتا ہے۔

از کلید دین در دنیا کشاد   ہمچو او بطن ام گیتی نزاد

اقبال سعی وعمل اور جد وجہد کی بنیاد عشق پر رکھنی چاہتے ہیں، ہر موقع پر اسباب وعلل کا سہارا ڈھونڈنے کے وہ موافق نہیں، عشق کی بے باکی نے دنیائے عمل میں اکثر ایسے کرشمے دکھائے ہیں، کہ عقل حیران رہ گئی ہے۔

گرچہ تو زندانی اسباب ہے   قلب کو لیکن ذرا آزاد رکھ
عقل کو تنقید سے فرصت نہیں   عشق پر اعمال کی بنیاد رکھ

عشق میں مصلحت اندیشی عشق کے خام ہونے کی دلیل ہے جب کہ یہی مصلحت اندیشی عقل کی پختگی کی علامت ہے۔

پختہ ہوتی ہے اگر مصلحت اندیش ہو عقل   عشق ہو مصلحت اندیش تو ہے خام ابھی

اسی مصلحت اندیشی کی وجہ سے اکثر عقل جھجک کر رہ جاتی ہے اور عشق عمل کے اکھاڑے میں کود پڑتا ہے۔

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق   عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

آغاز وانجام سے بے نیاز، موقع ومحل کی نزاکتوں سے بے خبر اور زمانے کے نشیب وفراز سے بے پرواہ۔

شیوۂ عشق ہے آزادی و دہر آشوبی   تو ہے زناری بتخانۂ ایام ابھی

عقل سحر و شام گنتے رہتے ہیں وقت گذار دیتی ہے جب کہ زندگی سعی و عمل چاہتی ہے۔

سعی پیہم ہے ترازوئے کم و کیف حیات تیری میزان ہے شمار سحر و شام ابھی

دین و مذہب اب دین و مذہب خدا اور بندے کا نجی اور محض روحانی رشتہ نہیں رہا ہے بلکہ حیات انسانی میں اس کی انفرادی اور معاشرتی اہمیت ہے، مقصد اس کے حصول کی تمنا اور اس تمنا کو حقیقت بنانے کے لیے جد و جہد، اقبال کا قدیم تاثر ہے اور چونکہ انسانی حیات کی بلندی اور عظمت میں اس کے مقاصد کی بلندیوں اور عظمتوں کو ہمیشہ سے بڑا دخل رہا ہے، ان عظمتوں اور بلندیوں کا پیمانہ اقبال کے نزدیک اب خالص مادی یا محض انسانی نہیں رہا ہے، اس میں ایک طرح کا تکوینی تقدس شامل ہے، اغراض سے پاک اور فیوض و فضائل کا حامل، اس کے ڈانڈے براہ راست دین و مذہب سے ملے ہوئے ہیں چنانچہ "فردوس میں ایک مکالمہ" کے زیر عنوان عہد حاضر کے نوجوانوں کی زمین گیر، اور زمین تاز فطرت کا ماتم اور ان کے مادی انداز نظر کا شکوہ کرتے ہوئے حالی کی زبان سے کہتے ہیں،

دین ہو تو مقاصد میں بھی پیدا ہو بلندی فطرت ہے جوانوں کی زمیں گیر زمیں تاز

شخصیتوں کے انبوہ کو ملت کی صورت میں منظم کرنے کا جہاں تک تعلق ہے افراد اور شخصیتوں کی ہم آہنگی پر موقوف ہے اور مسلمانوں کی ہم آہنگی دین و مذہب کی مرہون رہی ہے، اور آج بھی مذہب پر ہی منحصر ہے، اسی نظم میں کہتے ہیں،

مذہب سے ہم آہنگی افراد ہے باقی دیں زخمہ ہے جمعیت ملت ہے اگر ساز

بنیاد لرز جائے جو دیوار چمن کی ظاہر ہے کہ انجام گلستاں کا ہے آغاز

موت اور شخصی بقا شخصی زندگی کی بقا جو پہلے محض شاعرانہ تخیل تھی اب مستقل فکر ہے،

انھیں اب یقین ہو گیا ہے کہ انسانی جوہر حیات ناآشنائے عدم ہے؛ شعلۂ حیات کی قسمت زدہ افسردگی نہیں،

زندگی کی آگ کا انجام خاکستر نہیں ٹوٹنا جس کا مقدر ہو یہ وہ گوہر نہیں

موت ایک بالکل نئی قسم کی زندگی گذارنے کے لیے خاص استعداد بہم پہنچانے کا وقفہ ہے۔

موت تجدید مذاق زندگی کا نام ہے خواب کے پردے میں بیداری کا اک پیغام ہے

گویا اسی سے اس نئی دوامی زندگی کا آغاز ہو جاتا ہے،

موت کو سمجھے ہیں غافل اختتام زندگی ہے یہ شام زندگی، صبح دوام زندگی

خودی کا ضعف و استحکام اور ان کے اسباب و آثار تاریخ کے تجزیے سے اقبال اس نتیجے پر پہنچ گئے تھے کہ قومیں ہوں یا افراد، ان کا استحکام و اضمحلال یا عروج و زوال ان کی انفرادی یا اجتماعی شخصیت اور خودی کے استحکام و اضمحلال پر موقوف ہے خودی مستقل طاقت ہے جو اپنے اظہار کے لیے بیتاب اور عمل کے لیے میدان کی جویا رہتی ہے، تصادم کے موقعے تلاش کر کے قوت کا مظاہرہ کرنا چاہتی ہے، چنانچہ افراد و اقوام کے عروج و زوال میں کشاکش اور ستیزہ کاری کی اہمیت کی یہی بنیاد ہے، یہ ایک نامی اور جذاب و پر کشش قوت ہے، غلبہ اور استیلاء اس کی خاصیت ہے، اس کی پائندگی اور زندگی میں عشق کو خصوصی دخل ہے، استحکام و پائندگی کے لحاظ سے اسکی منزلیں اور ان کی خصوصیتیں، اقبال کے اسی عہد کے تصورات ہیں، خودی کی قوت اور اس کے ضعف میں تاثیر کے لحاظ سے روایتی مسلم تصوف سے بیزاری اور اسپر کڑی نکتہ چینی اسی زمانے کی فکر ہے[1]

(حاشیہ اگلے صفحہ پر)

خودی کی خلاقی اور وحدت وجود خودی کا انقسام اور اس کے نتیجے میں اس کی خلاقی، عقل و احساس کی آفرینش، عامل و معمول اور اسباب و علل کی صورت میں اسکے مختلف تشکلات، زمانے کا حقیقی اور خلاق تصور پھر خودی کا کائنات اور زمانے پر شامل ہونا، امواج بحر کی طرح کائنات کی بحر وجود سے معیت اور قدامت گویا وجودی وحدت کی نئی تعبیر اقبال کی خودی کے اسرار نہاں ہیں، جن کو انھوں نے "الٰہیاتِ اسلامیہ کی تشکیل جدید" میں کھولا ہے۔[1]

فرد اور ملت فرد اور جماعت کے رشتے نے اسی دور میں مربوط اور متعین شکل اختیار کی اور مستقل فکر کی حیثیت حاصل کی، ان کی خودی یا شخصیت کے تصور میں اور کسی اجتماع کے ذہن میں جو ناآہنگی تھی، اس کو رضاکارانہ ہم مقصدیت سے دور کرنے کی کوشش کی فرد اور جماعت کے باہم دگر افادے و استفادے کی نوعیت واضح کی ملت اور اجتماع یا اجتماعی خودی کی تشکیل ہی کے استحکام اور کثرت کے وحدت میں تحویل ہونے اور وحدت کے کثرت میں پھیل جانے کی کیفیت' ملت کے .... نظم وضبط کے لئے دستور وآئین کی پابندی یا شریعت پر عمل کی اہمیت پر زور دینا اسی زمانے کی فکر ہے۔[2]

حرکتِ زندگی اور فکر حیات کی حرکت اور تغیر سے توجہ فکر اقبال کی اسی عہد کی پرواز ہے، عرض وجوہر سمیت پوری کائنات کی حرکت و تغیر میں تحویل اگرچہ واضح نہیں ہے، لیکن فکر کا رُخ اشاروں اشاروں میں متعین ہونے لگا ہے، فکر کی گران خیزی اور چیزوں کو جامد بنا کر دیکھنے کی فطرت پر بھی گذرتی سی روشنی ڈالدی ہے'

(حاشیہ ص ۹۱) [1] مثنوی اسرار خودی، بانگ درا، ارتقا، ص۲۴۹ اقبال نامہ مکتوب سوم بنام منشی سراج الدین، ایضاً مکتوب اول بنام سراج الدین پال ص۳۴ (حاشیہ ص ہٰذا)
[1] پیام مشرق، اسرار خودی، [2] مثنوی رموز بیخودی

گر نظر داری یکے بر خود نگر ‌‌ جز رم پیہم نہ اے بے خبر
تا نماید تاب تا مشہود خویش ‌‌ شعلۂ او پردہ بند از دود خویش
آتش او دم بخویش اندر کشید ‌‌ لالہ گر دید و ز شاخے بر دمید
فکر خام تو گران خیز است لنگ ‌‌ تہمت گل بست بر پرواز رنگ
زندگی مرغ نشیمن ساز نیست ‌‌ طائر رنگ است بجز پرواز نیست

انسان کی خلاقی اقبال نے انسان کے نایب خدا ہونے کے لحاظ سے اُس کے خلاق ہونے پر بھی زور دیا ہے، فطرت کی ان گھڑ، مخلوق کی تزیین و تحسین اور اپنے مقاصد و مصالح کے مطابق ان کی تحویل اور ضروری تراش وخراش انسان کی ذمہ داری ہے۔[1]

جہان او آفرید این خوب تر ساخت ‌‌ مگر با ایزد انباز است آدم

حسن و قبح یا خوب و زشت حسن و قبح یا اچھائی برائی کا انکی ذاتی اور اندرونی حیثیت میں کوئی وجود نہیں، ذات جب مظہری حیثیت اختیار کرتی ہے، اور حسی عالم میں اس کا ظہور ہوتا ہے، تو گل بھی نمایاں ہو جاتا ہے، اور خار بھی،

چہ گویم نکتۂ زشت و نکو چیست ‌‌ زبان لرزد کہ معنی پیچدار است
برون از شاخ بینی خار و گل را ‌‌ درون او نہ گل پیدا نہ خار است

۱۹۲۲ء سے ۱۹۲۶ء تک فکری لحاظ سے یہ عہد خودی کا عہد ہے، خودی کے عضوی اجزا یا رخوں کی تحلیل، ان کی تشریح، خصوصیات اور ان کا اندرونی یا باطنی اور بیرونی یا خارجی اطلاق اور اس کے اثرات اقبال کا موضوع فکر ہیں، حیات، شعور اور عزم و ارادہ کی کرشمہ زائیاں، اعماق خودی کی پہنائیاں اور اُس کی باطنی کیفیتیں، اسکی سائی، اسکا جذب اور کشش، خودی میں استغراق یا وقتی التفات اور ان میں عشق کی

کارکردگی اور اس کے اثرات، زمانے کی اندرونی بقائے محض اور بیرونی تدریج دگذران خودی کے گوشے ہیں، جن پر روشنی ڈالی گئی ہے، آفرینش کائنات کا مقصد، خودی میں خدا کا جلوہ اور یقین کی اہمیت ساتھ ساتھ سیاسی اور اقتصادی تاثرات، ملوکیت، سرمایہ و مزدور، فقر و درویشی کی حقیقت اور زندگی کی جاودانی کا راز اسی عہد کے تصورات ہیں۔

اس دور میں فلسفۂ اقبال کے قریب قریب سب پہلو اجمالاً اور اشاروں اشاروں میں آگئے ہیں، گویا الٰہیات اسلامیہ کی تشکیل نو، کے خطبے اسی اجمال کی تشریح اور ان ہی اشاروں کی تفصیل ہیں، اور پوری فلسفیانہ دقت اور ژرف نگاہی کے ساتھ،

شعور اور وجدان فکر کے برخلاف جو چیزوں کو جامد بنا کر ٹکڑوں میں دیکھتی ہے، خودی اپنے باطنی شعور یا وجدان کے ذریعے سے دونوں جہان کا لمحاتی اور آنی ادراک کر لیتی ہے، جس کے لیے عشق مہمیز کا کام کرتا ہے۔

مے شود پردۂ چشم پر کاہے گاہے | دیدہ ام ہر دو جہان را بنگاہے گاہے

خودی کا باطنی شعور محض انفعالی نہیں ہوتا وہ اپنی اندرونی حیثیت میں فعلی اور تخلیقی ہے۔

این جہان چیست؟ صنم خانۂ پندار من است | جلوۂ او گرو دیدۂ بیدار من است

ہمہ آفاق کہ گیرم بنگاہے او را | حلقہ ہست کہ از گردش پرکار من است

ہستی و نیستی از دیدن و نادیدن من | حلقہ ہست کہ از گردش پرکار من است

جہان کا انقلاب خودی کے باطنی شعور کی نگہ التفات کا انقلاب ہے شعور بدلا اور دنیا بدلی۔

بجز و نگہ گلہ ہائے جہان چہ مے گوئی | اگر نگاہ تو دیگر شود جہان دگر است

جہانِ کہنہ اگر موافق مزاج نہیں تو دوسرے جہان پیدا کر لینا خودی کے بس سے باہر نہیں۔

کہنہ را در شکن و باز بہ تعمیر خرام | ہر کہ در ورطۂ "لا" ماند بہ "الا" نرسید

خلق کا مقصد خواہشِ ظہور کا نتیجہ خلق ہے، جس کا مقصد خود تماشائی کے سوا کچھ نہیں۔

صورت گرے کہ پیکر روز و شب آفرید | از نقش این و آن بہ تماشاے خود رسید

تخلیقی زمانہ یا غیر تدریجی بقا و استمرار زمانہ اپنی تمام تخلیقی خصوصیتوں کے ساتھ خودی سے باہر کی حقیقت نہیں یہ خودی کی گہرائیوں میں بغیر گذران اور تجدد و تدریج کے بقائے خالص اور دوام محض کی صورت میں محفوظ ہے، تدریج اور تجدد اس کے ظہور اور خروج سے تعلق رکھتے ہیں،

در شیشۂ او جان روزگار است | دلے بر ما بتدریج آشکار است

خدا جوئی مسلم صوفی، اپنی خودی اور انانیت کو خدا میں فنا کر کے یزدان شکاری کرتے ہیں، اقبال خدا کی جستجو میں انانیت کو فنا کرنے کے قائل نہیں، وہ انانیت کو نشو و نما دے کر اُسے اتنا قوی بنا لیتے ہیں کہ خودی خدا کو بھی سما لیتی ہے، ایسی انانیت میں استغراق درحقیقت یزدان شکاری ہے۔

اگر زیری ز خود گیری زبر شو | خدا خواہی بخود نزدیک تر شو

حیات زندگی وقتی اور عارضی حقیقت نہیں کہ جلد یا بدیر لے لی جائے گی یا خود بخود افسردہ ہو کر ختم ہو جائے،

از مرگ ترسی اے زندہ جاوید | مرگ است صیدے، تو در کمینی

ہر شے کو جذب کر لینا اور پوری کائنات کو اپنے اندر سما لینا زندگی کی خاصیت ہے،

اگر یہ خاصیت نہ پیدا ہو تو زندگی ناپختہ ہے اور زوال کی علامت ہے،

حیات چیست جہان را اسیر جان کردن
تو خود اسیر جہانی کجا توانی کرد

اس کو پختہ اور جاوداں بنانے کے لیے مسلسل حرکت، متواتر عمل اور نہ ختم ہونے والی پیش قدمیوں کی ضرورت ہے،

پختہ تر ہے گردش پیہم سے جام زندگی
ہے یہی اے بیخبر راز دوام زندگی

یقین کی اہمیت

سعی و عمل اور اقدام کے لیے تو یقین کی اہمیت نئی بات نہیں، اقبال بھی اپنے انداز میں کہہ چکے ہیں کہ :-

عمل خواہی و یقین را پختہ تر کن
یکے جو و یکے بیں و یکے باش

لیکن اقبال کے نزدیک زندگی کے دوام سے بھی اس کا چولی دامن کا ساتھ ہے، یقین ہی زندگی کو مستحکم اور لازوال بناتا ہے

جانے کہ بخشند دیگر نگیرند
آدم بمیرد از بے یقینی

فقر و درویشی

فقر و درویشی ذلت و مسکنت نہیں، یہ جوہر خودی ہے جو اپنے عیار میں کسی کا محتاج نہیں اور خود سلطانی اور شہریاری ہے،

ز جوہرے کہ نہان است در طبیعت ما
مپرس صیرفیان را کہ ما عیار خودیم

اس فقر و درویشی کے بوریا کے نیچے شہنشاہیاں پڑی رہتی ہیں،

چون بکمال مے رسد فقر دلیل خسروی است
مسند کیقباد را در تہ بوریا طلب

جمہوریت اور سرمایہ و محنت

مغربی جمہوریت پر نکتہ چینی اور سرمایہ و محنت کی آویزش میں سرمایہ دار کے ہتھکنڈوں کو اجاگر کرنا، اس کے ظلم و ستم دکھا کر مزدور کو جنگ پر آمادہ کرنا اور نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب و رنگ کو سرمایہ

پرستی کے زاویۂ نظر سے دیکھنا اسی عہد کا انداز نظر ہے،

ہے وہی ساز کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں جز نوائے قیصری

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

مجلس آئین و اصلاح و رعایات و حقوق
طب مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری

نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب و رنگ
خواجگی نے خوب چن چن کر بنائے مسکرات

مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار
انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

اٹھ کہ اب بزم جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

۱۹۲۶ء سے ۱۹۳۲ء تک

فلسفۂ اقبال کی تفصیل اور تکمیل کا یہی زمانہ ہے اسی وقفے میں اقبال کی زندگی کے متعدد اور مختلف رخوں پر فلسفی اور متکلم ہونے کی چھاپ نمایاں ہوئی، اور یہ فیصلہ کرنا دشوار ہو گیا کہ وہ عظیم ملی شاعر ہیں یا عظیم مسلم فلسفی۔

یہ پہلے گذر چکا ہے کہ اقبال کا ابتدائی گھریلو اور مکتبی ماحول مذہبی اور صوفیانہ تھا، مغربی فلسفہ ان کا تعلیمی مضمون اور فلسفۂ مشرق ان کا تحقیقی میدان تھا، مسلمانوں کا مذہبی، اخلاقی، سیاسی اور اقتصادی تنزل اور مغرب کی حرکت اور جد و جہد اور اس کے ثمرات ان کے پیش نظر تھے، یورپ کی مادیت اور اسکے تحت اس کی ترقیوں نے ایشیائی قوموں کی نظریں خیرہ کر دی تھیں اقبال کے

میلانات، خیالات اور تصورات کی اپنی ایک خاص رو تھی جو متصوفانہ اور فلسفیانہ ہوتے ہوئے بھی دعوتِ عمل تھی، اور فی الواقع ایسی منظم اور مفصل مابعد الطبیعیات کی متقاضی تھی، جو اُس کا منبع اور بنیاد بن سکے اور یہ پارہ پارہ تصورات مستقل فکر کی صورت حاصل کر سکیں، اور ساتھ ساتھ جدید علوم و حکمت کے مقابلے میں نئے علم کلام کی بنا پڑ جائے۔

خطبات | الٰہیاتِ اسلامیہ کی تشکیلِ جدید سے متعلق خطبات ان کے تصورات کی اسی رو کی مابعد الطبیعیاتی بنیاد ہیں، جس کے بغیر نہ ان کے تصورات میں نظم پیدا ہوتا ہے نہ ان کی معنویت واضح ہوتی ہے، اس تشکیلِ جدید پر غور و فکر کی ابتدا تو پہلے سے ہو چکی تھی، اور اجتہاد یا اسلام کی تعمیر میں اصولِ حرکت، پر وہ اپنے خیالات کو ایک حد تک ترتیب بھی دے چکے تھے[1]، مگر آخری تکمیل ۱۹۳۰ء سے پہلے نہیں ہو سکی اور وہ بھی چھے خطبوں کی صورت میں[2]، ساتواں خطبہ "کیا مذہب کا امکان ہے؟" جو آکسفورڈ کی ارسطاطالیسی مجلس کی دعوت پر لکھا گیا تھا، ۱۹۳۲ء سے پہلے تکمیل نہیں ہو سکتا تھا[3]، یہ خطبے اگرچہ دیرینہ اور تدریجی غور و فکر کا نتیجہ ہیں، لیکن پھر بھی تشکیلِ جدید کے موضوع پر اگر ان کی تصنیف مستقل اور مرتب نظامِ فلسفہ کی صورت میں ہوتی تو یقیناً کہیں زیادہ مستحکم، مربوط، جامع اور زیادہ تحقیقی اور انتقادی ہوتی، اور اسلامی علوم و فنون کے اصل منابع کا براہِ راست اور زیادہ استیعاب سے مطالعہ[4] ان کی تحقیق، نقد اور

---

[1] اقبال نامہ، مکتوب بنام مولانا عبدالماجد کا ذیلی حاشیہ ص ۳۳۸ و ذیلی حاشیہ مکتوب بنام سید سلیمان ندوی ص ۱۵۱[2] مکتوب بنام غلام بھیک، اقبال نامہ ص ۲۱۱[3] مکتوب بنام شجاع منعی، اقبال نامہ ص ۲۲۰

[4] اقبال نامہ کے متعدد خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ اکثر انھیں براہِ راست اور بالاستیعاب مطالعے کے مواقع حاصل نہ تھے۔

رائے قائم کرنے میں بھی زیادہ معاون ثابت ہوتا۔

ان خطبوں میں طبیعیات کی قدیم بنیادوں پر نقد ہے، اور نفسیاتی تجربوں اور مشاہدوں کی سند پر روحانی قسم کی مابعد الطبیعیات کی تاسیس ہے! ایک روحانی اساس سے خلق اور خلاق اور ان کے عوارض و صفات کی توجیہ کی گئی ہے، مذہب کی ایمانی حقیقتوں کا استخراج کیا گیا ہے، مذہبی اعمال کی قدریں واضح کی گئی ہیں، اور اس طرح اسلام کی جدید الٰہیات کی تشکیل کی گئی ہے۔

ان خطبوں میں اسلام سے متعلق قریب قریب سب ہی اصولی اور بنیادی عقائد آگئے ہیں؛ ذاتِ باری، وحی و رسالت، جبر و اختیار اور تقدیر، لوحِ محفوظ، حیات بعد الموت، جنت و جہنم اور نامۂ اعمال وغیرہ سب کی اپنے مابعد الطبیعیاتی موقف سے تشریحیں ہیں۔

اصل حقیقت کی نوعیت، شعور، ارادہ، زمان اور خودی کا عضوی تعلق، کائنات اور حسی مظاہر اور ان کی افعال فردہ سے توجیہ، خلق و آفرینش کے معنی، عالمِ خلق اور عالمِ امر کی حقیقت، روح و بدن کا فرق، باری تعالیٰ کی محدودیت، حدوث و قدم، موت، برزخی اور اُخروی زندگی وغیرہ کے متعلق مجمل اور کہیں مفصل بیان ہے، ضمناً اخلاقی اور سیاسی مسائل پر بحثیں بھی آگئیں ہیں، اسلامی قانون کی نئی تعبیروں کا جواز اور اُس کی حرکیت اور نامی ہونے پر مفصل بحث ہے، اسلامی مجالسِ قانون ساز کی حیثیت اور اُن کے حدود و قانون سازی کی توضیح بھی ہے، "خطبات اقبال" کی ضمنی اہمیت یہ ہے کہ یہ ان کے اشعار کی شرح ہیں، انکو سامنے رکھے بغیر اقبال کی شاعری کا بیشتر حصہ مبہم یا بے معنی معلوم ہوتا ہے، گویا اقبال کی انفرادی شاعرا

تخیل نے جو مبہم اور استعاروں کنایوں میں تھی واضح اور حقیقت کا رنگ اختیار کر لیا ہے اور فلسفے کی صورت میں انفرادی کے بجائے اجتماعی تخیل ہو گئی ہے۔[1]

اشتراکیت اور اسلام مسٹر فرانسس نیگ ہسینڈ کے نام ایک خط میں اقبال نے اسلام اور اشتراکیت کے فلسفۂ اقتصاد کی یکسانی پر زور دیا ہے، اور دونوں کے اساسی فرق کو واضح کیا ہے،[2]

امومتِ زن اسی زمانے میں عورت کے صنفی فریضے اور اس کی فطری خصوصیت پر روشنی ڈالی ہے، اور مرد و زن کی خلقی وابستگی کو واضح کیا ہے،

مرد و زن وابستۂ یک دیگرند — کائناتِ شوق را صورت گرند

مرد شعلۂ حیات کو تب و تاب دیتا ہے تو عورت اس کو قائم رکھتی ہے، اور اپنے جوہر کو اس میں تپا کر اکسیر بنا لیتی ہے اور یہی اکسیر خاک کو انسانی جوہر میں بدل دیتی ہے،

زن نگہ دارندۂ نارِ حیات — فطرت او لوحِ اسرارِ حیات
آتش ما را بجان خود زند — جوہر او خاک را آدم کند

حسن و قبح کا شرعی ہونا یہ پہلے گذر چکا ہے کہ حسن و قبح یا خوب و زشت چیزوں کی ذاتی صفتیں نہیں جہاں تک ان کے معیار کا تعلق ہے تو چونکہ عقل کے سامنے ذاتی بہبود ہوتی ہے، اور وحی کی نظر عام فلاح پر رہتی ہے،

---

[1] اقبال نے پہلے خطبے کے پہلے ہی صفحے میں بیان کیا ہے کہ اعلیٰ شاعری، فلسفہ اور مذہب تینوں کے سامنے ایک ہی قسم کے سوالات ہوتے ہیں، اعلیٰ شاعری ان سوالوں کا جواب استعاروں کنایوں میں دیتی ہے اور یہ مبہم اور انفرادی ہوتے ہیں۔ [2] اقبال کی تقاریر و بیانات" مرتبہ شاملو ص ۱۵۱

عقل خود بیں غافل از بہبود غیر — سود خود بیند، نہ بیند سود غیر
وحی حق بینندۂ سود ہمہ — در نگاہش سود و بہبود ہمہ

اس بندۂ حق کے لیے ان کا معیار وحی حق کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا

رسم و راہ و دین و آئینش ز حق — زشت و خوب و تلخ و نوشینش ز حق

زمین کا ملک عام ہونا پہلے گذر چکا ہے کہ اقبال اشتراکی فلسفۂ اقتصاد اور اسلامی فلسفۂ اقتصاد کو اصولاً متحد جانتے تھے، یہ نظریاتی فرق تھا کہ اسلام کے فلسفۂ اقتصاد کی اساس ان کے نزدیک مثبت تھی، اور اس لیے زیادہ مستحکم تھی برخلاف اشتراکیت کے کہ وہ عارضی بنیادوں پر قائم ہے، چنانچہ اپنے اس نقطۂ نظر کے تحت وہ زمین کو عام ملک قرار دیتے تھے،

ارضِ حق را ارضِ خود دانی بگو — چیست شرح آیۂ لا تُفسِدُوا

۱۹۳۳ء سے .... اقبال کے فلسفے یا فلسفۂ خودی کی تکمیل "الہیات اسلامیہ کی تشکیل جدید" ہو گئی تھی اور قریب قریب اس کے اصولی اور بنیادی پہلو خواہ اجمالاً خواہ تفصیلاً اسی دور کی فکر تھے، اس آخری عہد میں زیادہ تر گذشتہ افکار کا ہی مختلف انداز سے اعادہ ہے؛ بیان کے اسلوب جدا جدا ہیں، جزئیات بدلی ہوئی ہیں، زاویۂ نظر الگ الگ ہیں لیکن اصل فکر میں وحدت ہے، نیا تصور بہت شاذ و نادر ہے، کبھی کبھی اور کہیں کہیں کوئی نیا خیال توجہ کو جذب کرتا ہے تو بیشتر اس کی نوعیت فروعی ہوتی ہے، چاہے اس کا تعلق الہیات سے ہو یا اخلاقیات و سیاسیات سے تہذیب و مدنیت سے ہو یا جمالیات سے۔

مظاہرۂ قوت کی اہمیت قوت کی نمایش اور شوکت کے اظہار کی انفرادی اور اجتماعی

زندگی میں جو قدر و قیمت ہے، اس کو طرح طرح سے واضح کیا ہے، طاقت ہوتے ہوئے کمزوری دکھانا حیف ہے۔

وائے آں شاہین کہ شاہینی نکرد — مرغکے از چنگ او نامد بدرد

لیکن بے سوچے سمجھے اندھا دھند طاقت کو جھونک دینا اگر سراسر جنون اور ابلہی ہے تو ایسی سوجھ بوجھ جس کی پشت پر طاقت نہ ہو محض روباہی اور مکاری ہے

وائے بے قوت ہمہ مکر و فسون — قوت بے رائے جہل است و جنون

انفرادی جرائم اور قومی جرائم کا فرق افراد کے گناہ اگر اجتماع اور معاشرے میں سرایت نہ کریں تو وہ محدود ہوتے ہیں، زیادہ سے زیادہ فرد پر اثر انداز ہوتے ہیں، اور کبھی کبھی وہ بچ بھی جاتا ہے، اور کم از کم معاشرہ محفوظ رہتا ہے اور تباہ یا کمزور نہیں ہوتا، لیکن اگر کوئی معاشرہ جرائم پیشگی اختیار کر لے تو پورا معاشرہ ذلت و نکبت میں گرفتار ہو جاتا ہے، اور اپنے کیفرِ کردار سے نہیں بچتا۔

فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے — کبھی کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف

مرد کا صنفی فریضہ مرد و زن کا صنفی فرق پہلے واضح کیا جا چکا ہے کہ وہ شعلۂ حیات کو پیدا نہیں کرتی بلکہ اس کو قائم اور محفوظ رکھ کر اپنے جوہر کی اکسیر سے خاک کو انسان بناتی ہے، اس کا یہ جوہر اس کی یہی معصوم نسوانیت ہے جو اُمومت کی شکل میں نمایاں ہوتی ہے اور اس نمود میں خود مرد کو دخل ہے۔

جوہر مرد عیاں ہوتا ہے بے منت غیر — غیر کے ہاتھ میں ہے جوہر عورت کی نمود

اس لیے اس جوہر کی حفاظت بھی مرد کا منصبی فرض ہے، تعلیم یا پردہ جیسے مصنوعی طریقے اس حفاظت سے قاصر ہیں۔

نے پردہ نہ تعلیم نئی ہو کہ پرانی — نسوانیت زن کا محافظ ہے فقط مرد

حسن و جمال کا معیار اور علوم و فنون و ادیان کی قیمت حسن و جمال ہو یا علوم و مذاہب غرض یہ کہ زندگی سے متعلق رکھنے والی ہر شے کی قدر و قیمت کا پیمانہ خود زندگی اور اس کی قوت ہے! اگر یہ حیات کے تحفظ، اس کی آفرینش اور جذب و استیلا میں ممد و معاون ہیں تو مفید اور قابل قدر ورنہ ناکارہ اور زندگی پر وبال اور بار دوش!

سرود و شعر و سیاست، کتاب و دین و ہنر — گہر ہیں ان کی گرہ میں تمام یک دانہ

اگر خودی کی حفاظت کریں تو عین حیات — نہ کر سکیں تو سراپا فسون و افسانہ

شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو — جس سے چمن افسردہ ہو وہ باد سحر کیا

مری نظر میں یہی ہے جمال و زیبائی — کہ سر بسجدہ ہیں قوت کے سامنے افلاک

مہدی کا تخیل ابن خلدون کے انتقاد کی سند پر اقبال روایتی امام مہدی کی آمد کے قائل نہیں تھے لیکن ان کی رجائیت ان کو کسی ایسے مہدی مجدد یا انسان کامل کے ظہور کا منتظر رکھتی تھی، جو اسلام کی قوت و شوکت کا باعث اور اس کی غیر اسلامی عناصر سے تطہیر میں ممد و معاون ہو، اس کو مہدی کہا جائے یا نہ کہا جائے[1] تاہم وہ اس تصور کو فعال اور قوت کی حیثیت میں دیکھنا چاہتے تھے، وہ نطشے کے تخیلی فوق البشر کی نعالی کو جرمن قومیت کی قوت کی صورت میں دیکھ چکے تھے اور چاہتے تھے کہ اسی طرح یہ تصور ہر مسلمان کو اپنی تمام طاقتوں کو اس کے ظہور کی راہ ہموار کرنے پر آمادہ کر دے اور ملت اسلامیہ کے احیا اور اس کی نشأۃ ثانیہ کا ذریعہ ہو جائے، چنانچہ وہ مسلمانوں کو اس تصور سے محروم کرنے کے حامی نہ تھے، مگر[2]

---

[1] مکتوب بنام ضیاء الدین برنی، انوار اقبال ص ۱۴۴

[2] اے وہ کہ تو مہدی کے تخیل سے ہے بیزار — نومید نہ کر آہوئے مشکیں سے ختن کو

مجذوبِ فرنگی نے بانداز فرنگی — مہدی کے تخیل سے کیا زندہ وطن کو

تو پھر ملت اسلامیہ کا روایتی اور قدیم تصور اسکی حیات بخشی سے از کار رفتہ کیوں ہو جبکہ پوری

دنیا کو ہے اس مہدی برحق کی ضرورت — ہو جس کی نگہ زلزلۂ عالم افکار

بندۂ صحرا یا مرد کہستانی | اقبال کا خیال تھا کہ فرزند صحرا یا مرد کوہستانی اپنی فکر و ضمیر کے بے رنگ اور قوائے عمل کے تیز تر ہونے کی وجہ سے فطرت کے مقاصد و مصالح کا سب سے بڑا پاسبان ہے۔

فطرت کے مقاصد کی کرتا ہے نگہبانی — یا بندۂ صحرائی یا مرد کہستانی

عرفانِ خودی کی دیر ہے جہاں وہ اپنی عظمت سے واقف ہوا اور اس نے دنیا کی تقدیر بدلی، تاریخ کے اوراق سادہ اُس کے اپنے قلم سے اس کی سرنوشت لکھنے کو بیتاب رہتے ہیں،

تو اپنی سرنوشت اب اپنے قلم سے لکھ — خالی رکھی ہے خامۂ حق نے تری جبین

چنانچہ افغانی قبائل کو تاریخ کے اہم انقلابوں کو یاد دلا کر آمادہ کرنے کی یہی وجہ تھی،

رومی بدلے، شامی بدلے، بدلا ہندوستان — تو بھی اے فرزند کہستان اپنی خودی پہچان

اپنی خودی پہچان — او غافل افغان!

افکار اقبال | افکار اقبال پر یکجائی نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۱۹۱۲ء تک ان میں تغیر و تبدل برابر جاری ہے، لیکن اس کے بعد اضافے ہوتے رہے ہیں، اور پوری ہمواری کے ساتھ، کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی ہے، وحدت وجود کے تصور میں تو فرق آیا ہی لیکن وہ انکی فکر کا اہم گوشہ نہیں، خطبات کا عہد (سنہ ۱۹۲۰ء سے سنہ ۱۹۳۲ء) انکی فکر کا عہد شباب ہے اور خودی سے متعلق بعض وقتی تصورات کو اگر نظر انداز کر دیا جائے تو یہ فکر بالعموم متوازن ہے ان کے بعد کا زمانہ فکر کے قیام اور اسکے مختلف سطحوں پر گوناگون رنگوں میں اطلاق کا، اسکے تحت مختلف اعمال و افکار کے انعقاد کا عہد ہے۔

رصدگاہ محمد شاہی دہلی

یا

جنتر منتر

از جناب شبیر احمد خاں صاحب غوری ایم اے۔ ایل۔ ایل۔ بی سابق رجسٹرار امتحانات عربی و فارسی اتر پردیش

(۲)

جدید یورپی علم الہیئت سے استفادہ | متاخر مغل بادشاہوں کے عہد حکومت میں شہر دہلی میں یورپی ممالک کے فضلاء کی تجارتی نیز مذہبی تبلیغ کے سلسلے میں آمد و رفت تھی۔ ان لوگوں نے راجہ کے سامنے یورپ میں علم ہیئت کی ترقی کے قصے بڑھا چڑھا کر بیان کئے تھے، چنانچہ راجہ نے اپنے ہیئتی مطالعہ کے دوران جہاں الغ بیگ کی "زیج جدید گورگانی" "ملا چند منجم اکبر شاہی (؟) ہمایونی) کی "تسہیلات" "ملا فرید منجم کی "زیج شاہجہانی" وغیرہ اور ہندو جوتش و دیا کے معیاری شاہکار پڑھے تھے، یورپی ہیئت دانوں کی مرتبہ زیجیں بھی پڑھی تھیں: اور جب اس نے اپنی وقت کا بادشاہ کے سامنے اظہار کیا تھا تو موخر الذکر نے جہاں مسلمان مہندسین و منجمین اور برہمن جوتشیوں سے کاروبار رصد میں مدد لینے کا حکم دیا تھا، دانایان فرنگ سے بھی مشورہ لینے کے لیے کہا تھا، لہذا راجہ نے بھی یورپی ماہرین علم الہیئت سے استفادہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ ان کی حذاقت سے زیادہ متاثر نہیں ہوا،

بہرحال راجہ سات سال تک اپنے طور پر ہیئتی سرگرمیاں جاری رکھنے کے بعد ایک علمی وفد پادری مینویل فگیوریڈو (Padre Man) کی قیادت میں[1]، یورپ [بقول کرنل ٹاڈ پرتگال کے بادشاہ عمانویل (Emanuel) کے دربار میں] بھیجا کیونکہ اس زمانہ میں راجہ کو بتایا گیا تھا،

" در نزدیک باین زمان از فرنگ ہم آلات رصدی درست کردہ اند اکابر آنجا و دانایان شان باین کار شگرف مشتغل و متوجہ اند و کارخانہ رصد در آنجا ہنوز جاری است و ہموارہ در تحقیق دقائق این علم اند۔"

یہ وفد اپنے ہمراہ (L'Hire) کی ہیئتی جداول جس کا نظر ثانی شدہ ایڈیشن اس وقت سے کوئی تیس سال قبل شائع ہوا تھا، نیز اس سے پہلے کی زیجیں لے کر آیا۔[2]

[کرنل ٹاڈ کا کہنا ہے، کہ بادشاہ عمانویل نے زیویر ڈی سلوا (xuvied silva) کو راجہ کے پاس روانہ کیا، اس نے راجہ کو "لیر (Del Hire) کی زیچ سے متعارف کرایا مگر راجہ ان زیجوں سے مطمئن نہ ہو سکا کیونکہ انکے ذریعہ استخراج کی ہوئی قمر کی تقویم میں اور اس کی واقعی وضع میں جو براہ راست مشاہدہ سے حاصل ہوئی تھی،

[1] زیج محمد شاہی، ورق ۲ ظ۔

" بنا برعلیہ ازینجا چند کس معتمد عالم و دانائے این فن را برفاقت مینویل پادری بآن سمت فرستادہ۔"

(۲) زیج محمد شاہی، ورق ۲ ظ و ب

" زیج جدید آنجا کہ باسم لیر تسمیہ یافتہ و سی سال گزشتہ کہ بتازگی مرتب گشتہ با زیجہائے سابق آنجا را طلب داشتہ داد"

(۳) Tod : Annuals And Antiquities of Rajasthan Vol II P.259

۱/۲ درجہ کا فرق نکلا دوسرے سیاروں کی تقویم میں بھی غلطی پائی گئی، اور چاند گہن اور سورج گہن کے اوقات میں تو پندرہ پل [اور بقول کرنل ٹاڈ چھ منٹ] کا فرق نکلا راجہ کا خیال ہے کہ اس فرق و تفاوت اور غلطی کی وجہ یہ ہے کہ یورپ کی رصدگاہوں کے آلات اتنے بڑے نہیں تھے جتنے خود راجہ کی اپنی رصدگاہوں کے تھے۔[1]

زیویر ڈی سلوا کے علاوہ راجہ جے سنگھ نے اور یورپی فضلاء سے بھی استفادہ کی کوشش کی چنانچہ (Tieffenthaler) کی تصریح کے مطابق اس نے ۱۷۳۴ء میں (Father Boundiet) کو بنگال سے بلوایا تھا، نیز ۱۷۳۶ء میں جرمنی کے دو فاضلوں (Father Antony Glbelsperguer) (Andrew Strobl) کو زادراہ بھیج کر طلب کیا تھا۔[2]

سوال یہ ہے کہ کیا ان یورپی فضلاء نے راجہ کو متاثر کیا، اس باب میں دو رائیں سرسید احمد خان فرماتے ہیں:-

" یہ رصدخانہ وہ ہے کہ جس میں پہلے پہل انگریزی ہیئت جدید کے اکثر قواعد تسلیم کئے گئے ہیں۔ ورنہ اس سے پہلے یونانی ہیئت دانوں اور زیج بنانے والوں نے ان قاعدوں میں سے ایک کو بھی تسلیم نہیں کیا تھا اسی سبب سے یہ رصدخانہ اپنے ساتھیوں میں یکہ اور بہت نامی ہوا سنہ ۱۴ جلوس محمد شاہ مطابق ۱۱۴۴ھ ہجری موافق ۱۷۳۱ء عیسوی کے راجہ

(۱) زیج محمد شاہی، ورق ۲ ب " چوں در فرنگ آلات رصدی باین بزرگی و اتقان بحسب خواہش دل نساختہ اند، احکامیکہ بتوسط آن دریافتہ اند، پارۂ از تحقیق دور افتادہ۔"

(۲) Neuedge: Ma'Athir ul-Umana (English-Translation) Vol I P. 736 Foot note

سوائی جے سنگھ نے کئی آدمی ریاضی داں پادری مینویل کے ساتھ فرنگستان میں بھیجے اور وہاں سے آلات رصد دوربینیں منگوائیں، اور وہ لوگ خود بھی فرنگستان کا رصد خانہ دیکھ کر آئے، اور زیج جدید جس کا لیر نام تھا یہاں لائے، اور اس رصد خانے سے مطابقت کی۔ لیر کے حساب میں تقویم قمر میں آدھے درجہ کا اور کسوف و خسوف کے زمانہ میں چوتھائی دقیقہ یعنی پندرہ پل کا فرق نکلا، انھیں باتوں سے یقین ہوتا ہے کہ اس رصد خانے میں انگریز بھی شریک تھے، بلکہ انگریزی ہیئت جدید کے قواعد کا اس یونانی رصد خانے میں مان لینے کا بڑا سبب یہی معلوم ہوتا ہے، اگرچہ یونانی ہیئت دانوں نے ان نئی باتوں کو مان لینے پر بہت تکرار کی تھی، اور یہ بات چاہیے بھی تھی کہ ان باتوں کو عقلی دلیلوں سے ثابت کیا جائے، مگر جو کہ ان نئے قاعدوں سے جو بات کہ حساب کی راہ سے نکالی جاتی تھی، اور جو بات کہ رصد سے دیکھی جاتی تھی دو دونوں ٹھیک نکلتی تھیں، اس واسطے یہی مطابقت اُن قاعدوں کی صحت کو کافی متصور ہو کر عقلی دلیلیں قائم کرنے پر یا تو توجہ نہیں کی اور یا در حقیقت قائم نہو سکیں۔

اب اس مقام پر ایک مختصر فہرست ان باتوں کی لکھتے ہیں، جو برخلاف یونانی ہیئت کے اس رصد خانہ میں تسلیم کی گئی ہیں۔

(۱) مدار خارج مرکز شمس کو بعضی تسلیم کیا،

(۲) چاند کی حرکتوں کو بعضی مدار پہ مانا،

(۳) یہ بات تسلیم کی گئی کہ زہرہ اور عطارد بھی چاند کی طرح آفتاب سے روشن ہیں اور بدر اور ہلال ہوتے ہیں،

(۴) یہ بات مانی گئی کہ زحل گول کروی شکل پر نہیں، بلکہ اہلیجی شکل پر ہے،

(۵) مشتری کے گرد چار روشن ستارے قبول کئے گئے جن کا اقمار مشتری نام ہے،

(۶) آفتاب پر کے نشان مختلف مانے گئے کہ وضعی حرکت سے ایک برس کے قریب دورا پورا کرتے ہیں،

(۷) کواکب ثوابت درحقیقت ثوابت نہیں ہیں، بلکہ ان میں سے اکثر سیارہ ہیں

اس رصد خانہ میں رویت ہلال کی اور ظہور و خفائے کواکب اور طلوع و غروب منازلِ قمر کے حساب کرنے کی حاجت نہیں رہی تھی، کیونکہ دوربین کی مدد سے یہ سب چیزیں دن کو آنکھوں سے دیکھ لی جاتی تھیں۔"(۱)

اس کے برعکس نیدھم بڑے موکد الفاظ میں صراحت کرتا ہے کہ راجہ جے سنگھ پورے طور پر عربی اسلامی علم الہیئت کا نمائندہ تھا، بلکہ اپنی ہیئتی سرگرمیوں کو بادشاہ الغ بیگ کی ساعی کا تسلسل سمجھتا تھا۔

"Though A Hindu Working with Hindu Assistants, He was entirely in The Muslim-Arabic tradition of Astro-nomy, And considered Himself The continuatiom of The Work of Ulugh Beg."

(Joseph Needham, Science And Civilization in China, Vol. 3. P. 300)

[اگرچہ راجہ جے سنگھ خود ہندو تھا، اور ہندو معاونین کی مدد سے ارصادی

(۱) سرسید احمد خان۔ آثار الصنادید۔ صفحہ ۳۰۹-۳۲۱

سرگرمیاں انجام دے رہا تھا، مگر وہ کلیتہً اسلامی عربی الہیت کی روایات کا پیرو تھا، اور اپنی مساعی کو الغ بیگ کی کوششوں کا تسلسل سمجھتا تھا،]

دونوں ہی فاضل اپنے اپنے مقام پر خصوصی اہمیت کے مالک رہے ہیں،

سرسید احمد علیہ الرحمہ اُسی دہلی میں پیدا ہوئے، جس میں کوئی ایک صدی قبل یہ عظیم رصدگاہ قائم ہوئی تھی، وہیں انھوں نے تعلیم پائی اور وہیں بیٹھ کر اپنی کتاب "آثار الصنادید" مرتب کی۔ انھوں نے بنفس نفیس اس رصدگاہ کے "کھنڈروں" کو دیکھا اور ممکن ہے، ان لوگوں سے بھی معلومات فراہم کی ہوں جو اس رصدگاہ کے کارکنوں کے واقف کار رہے تھے، بایں ہمہ وہ انگریزوں اور ان کی تہذیب و ثقافت بالخصوص انگریزی علوم سے کچھ ضرورت سے زیادہ ہی مرعوب تھے،

اُدھر ڈاکٹر نیڈھم چین کی تہذیب و ثقافت بالخصوص چینی علوم کے ماہرین خصوصی میں ممتاز حیثیت کا مالک ہے، اگرچہ وہ ایک غیر ملکی محقق ہے، جو شاید ہندوستان نہیں آیا، بلکہ اُس نے اس ملک (ہندوستان) کے علوم و فنون کے ملکی و غیر ملکی ماہرین کی تصانیف پر اعتماد کیا ہے، مثلاً اُس نے دہلی اور جے پور کی رصدگاہوں کے بارے میں کایے، (G.R. Kaye) کی بھی تصانیف پر اعتماد کیا ہے، جن کا خلاصہ اس نے سویڈن کے ایک فاضل کی کتاب میں پڑھا تھا، بایں ہمہ وہ محض چینی علوم ہی کا ماہر خصوصی نہیں ہے، اُس نے اپنے محبوب ملک کی ثقافتی عظمت کے باب میں زمین آسمان کے قلابے نہیں ملائے بلکہ انتہائی ذمہ داری کے ساتھ عالمی ثقافتی تاریخ کے اندر چین کی علمی تاریخ اور اس کی فنی کاوشوں کا صحیح مقام متعین کرنے کی مخلصانہ کوشش کی ہے، وہ چین کی ثقافتی عظمت کا محض باد فروش بھاٹ ہی نہیں ہے، بلکہ اس کا

بے لاگ نقاد بھی ہے، اور اس حقیقت کی واشگافی میں کسی کوتاہی کا مرتکب نہیں ہوا کہ چین نے باقی دنیا کو کیا دیا، اور اس سے کیا لیا، اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کیلئے اُس نے چینی علوم کے دوش بدوش غیر چینی علوم کا بھی بڑی دقت نظر سے مطالعہ کیا اور اس کے اندر وہ، انسان کی فطری کوتاہیوں اور نارسائیوں سے قطع نظر ایک قابل تعریف حد تک کامیاب بھی ہوا ہے، اور اس ضمن میں اس نے ہندوستان اور بیرون ہندوستان کی اسلامی ہیئت پر بھی بڑی مبصرانہ نظر ڈالی ہے،

غرض دونوں ہی فاضل ناقابل نظر انداز اہمیت رکھتے ہیں۔ ایک (سرسید) اپنی قربت مکانی و زمانی اور ذمہ دارانہ سنجیدگی فکر کی بنا پر اور دوسرا (نیڈھم) اپنی وسعت مطالعہ اور عمیق تحقیق کی وجہ سے۔ اس لئے ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے یا ایک کی رائے کے مقابلے میں دوسرے کی رائے سے صرف نظر کرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا.

لہٰذا ان دو رایوں کے درمیان محاکمہ کا ایک ہی طریقہ رہ جاتا ہے، اور وہ ہے، خود اس رصدگاہ کے کارکنوں کی شہادت اور اس باب میں خود جے سنگھ کی مرتب کردہ "زیج" سے زیادہ فیصلہ کن اور کون شہادت ہو سکتی ہے۔

"مگر زیج محمد شاہی" کے مطالعہ سے جہاں نیڈھم (اور کایے) کی رائے کی تائید ہوتی ہے، سرسید علیہ الرحمہ کی رائے کی بھی تردید نہیں ہوتی، اس کی تفصیل حسب ذیل ہے،

(۱) نیڈھم کا ماخذ کایے (G.R.Kaye) ہے، جس نے اپنی مشہور تصنیف راجہ جے سنگھ کی رصدگاہیں" میں لکھا ہے۔

"اس باب میں ذرا سے بھی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ جس مخصوص عامل نے اُس کی (جے سنگھ کی) ہیئتی سرگرمیوں کا رخ متعین کیا، وہ الغ بیگ جیسے مسلمان ہیئت دانوں کا اتباع تھا۔"[1]

اور کاییٔ کے اس دعوے کی "زیج محمد شاہی" کے مطالعہ سے حرفاً حرفاً تصدیق ہوتی ہے۔ جے سنگھ کی ہیئتی سرگرمیوں کے دو پہلو ہیں، نظری اور عملی۔

۱۔ جہاں تک نظری پہلو کا تعلق ہے، "زیج محمد شاہی" کو اگر "زیج الغ بیگ" کا سرقہ کہنا سوءِ ادب ہو تو بھی، اُس کا چربہ ضرور کہا جا سکتا ہے۔ نہ صرف دونوں میں ترتیب و تقسیم کا انداز ہی مماثل ہے، ہیئتی مواد میں بھی غیر معمولی مماثلت ہے، بالخصوص دوسرے مقالہ میں دونوں کی عبارتوں میں صیغوں اور ضمائر کے اختلاف کے علاوہ اور کوئی فرق نہیں۔

۲۔ جہاں تک عملی پہلو کا تعلق ہے، خود راجہ کو اعتراف ہے کہ اُس نے اس باب میں الغ بیگ کی رصدگاہ سمرقند کی تقلید کی ہے:-

"چندے از آلات رصدی مانند آنکہ در سمرقند ساختہ بودند، از روئے کتب اسلامیان ہم ساخت۔"[2]

بے شک اُس نے کچھ نئے آلات بنوائے تھے، جن کے ہندی نام رکھے تھے، جیسے جے پرکاش، رام جنتر، سمراٹ جنتر۔ مگر بقول جی۔ آر۔ کایے۔

جے سنگھ کے تیار کردہ آلاتِ رصدیہ الغ بیگ اور اس کے پیشرووں یا جانشینوں کے استعمال کردہ آلات کی یا تو نقل تھے یا براہِ راست اصلاح۔"[3]

---

(1) G.R. Kaye: Astronomical observatories

(3) G.R. Kaye: ..P.89b زیج محمد شاہی ورق (۲) - of Jai Singh, P.69

جی۔ آر۔ کایے کے اس قول کی مزید تصدیق ان آلات کی ساخت اور مسلمان ہیئت دانوں کے بنائے ہوئے آلاتِ رصدیہ کے تقابلی مطالعہ سے ہو سکتی ہے۔ خوش قسمتی سے اسلامی رصدخانوں میں استعمال ہونے والے آلات کے موضوع پر ہنوز کافی کتابیں ہندوستان و بیرونِ ہندوستان کی لائبریریوں میں موجود ہیں جیسے موید الدین عرضی کا "رسالہ

فی کیفیۃ الارصاد وما یحتاج الی علمہ وعملہ من طرق
المؤدیۃ الی معرفۃ اوضاع الکواکب"

نیز مولانا عبد العلی برجندی کا "رسالہ فی آلات الرصد" و "مختصر فی بیان الرصد" علم المنعم عاملی کی کتاب "تعلیم آلات الزیج" ایک اور مصنف کا "رسالہ الخازنیہ فی الآلات الرصدیہ" وغیرہ اس طرح نیڈھم (Needham) اور جی آر۔ کایے (G.R.Kaye) کا یہ کہنا صحیح ہے کہ راجہ جے سنگھ کی ہیئتی سرگرمیاں یونانی۔ عربی روایات بالخصوص الغ بیگ کی فلکیاتی کاوشوں کا تسلسل تھیں۔

(۲) ایسا معلوم ہوتا ہے سر سید نے "زیج محمد شاہی" کا بالاستقصا مطالعہ کیا تھا، اور اس کاوش میں رصدگاہ دہلی کا اور کوئی تذکرہ نگار (حتیٰ کہ جی۔ آر۔ کایے بھی) انکا شریک و سہیم نظر نہیں آتا۔ ان موخر الذکر حضرات کے پیش نظر صرف اس "زیج" کے دیباچہ کا انگریزی ترجمہ تھا، مگر سر سید نے "زیج محمد شاہی" کا اس امعانِ نظر سے مطالعہ کرنے کے بعد اس میں جدید علم الہیئت کے جو اثرات پائے صرف انھیں کی نشاندہی کی ہے، غیر ذمہ دارانہ طور پر رصدگاہ دہلی اور "زیج محمد شاہی" کو کلیتہً جدید علم الہیئت سے متاثر نہیں بتایا،

جدید علم الہیئت (کوپرنیکی نظام ہیئت) کا اصل الاصول "شمسی مرکزی نظریہ"

(Helio-centric Theory) ہے، جس کی رو سے زمین آفتاب کے گرد چکر لگاتی ہے۔ سترہویں، اٹھارویں صدی کے ہندوستانی فضلائے ہیئت دان بھی اس حقیقت سے ناآشنا نہیں تھے، چنانچہ غلام حسین جونپوری جنھوں نے رصدگاہ دہلی کے قیام کے صرف سو سال بعد ہی "جامع بہادر خانی" لکھی تھی، فرماتے ہیں،

"انتباہ، حکمائے فرنگ ارض را بمدار بیضی متحرک می دانند و شمس را بر قطر اطول بیضی ساکن می پندارند بنوعیکہ مرکز شمس بریکے از دو نقطہ تقسیم منطبق است و مرکز منطقۃ البروج مرکز شمس است۔" (جامع بہادر خانی ص ۵۰۱)

مگر راجہ جے سنگھ نے اس انقلابی دریافت کا کوئی اثر نہیں لیا، کیونکہ یہ بات پورے ہیئتی نظام فکر میں انقلابی تبدیلی کی متقاضی تھی، اور راجہ کو جو اس وقت اپنے آقائے ولی نعمت محمد شاہ اور سلطنت مغلیہ کے استیصال کے لئے مرہٹوں کے ساتھ خفیہ طور پر سازش کر رہا تھا، اتنی فرصت کہاں تھی کہ نئے "شمس مرکزی نظریہ" کی اساس پر کیپلر اور نیوٹن وغیرہ کے اصول و قوانین کی مدد سے قدیم ہیئتی حسابات کے قواعد کے متبادل نئے قواعد کا استخراج کر سکے، اس لئے وہ اتنی جرأت تو نہ کر سکا۔ غالباً اسی جانب جی۔ آر۔ کائے نے اشارہ کیا ہے کہ جے سنگھ یورپی ہیئتی تحقیقات سے اُس وقت واقف ہوا جب کہ وہ اپنے ہیئتی منصوبہ کو تقریباً مکمل کر چکا تھا۔[1]

لیکن ثانوی اہمیت کے انکشافات ہیں، جن سے بعض کی تصدیق ٹیلسکوپ کی مدد سے برائے العین کر لی تھی، وہ جدید علم الہیئت کا ہمنوا ہو گیا۔

ہوا یہ کہ راجہ جے سنگھ نے پادری فگیو ریڈو مینویل[2] کے ہمراہ جو وفد فرنگستان (پرتگال)

(1) G.R. Kaye. P. 89 (2) Tod: Rajasthan Vol. II P. 289

بھیجا تھا، اس نے آکر فرنگی دوربین (ٹیلیسکوپ) کی کارکردگی اور افادیت کے قصے سنائے اس سے متاثر ہو کر راجہ نے بھی (غالباً ہندوستانی کاریگروں سے فرنگی ٹیلیسکوپ سے بھی زیادہ) طاقتور دوربینیں تیار کرائیں، جن کی مدد سے روز روشن میں اجرام سماوی کا مشاہدہ کر لیا جاتا تھا، چنانچہ وہ لکھتا ہے،

"چوں در سرکار ما دوربین ہا ساختہ اند کہ بواسطۂ آں کواکب ثابتہ روشن را در قریب نصف النہار در وسط السماء می بینیم ۔ ۔ ۔ ۔"[1]

سرسید نے جدید علم الہیئت کے اثرات کی فہرست میں آخری چیز یہ بتائی تھی کہ

"اس رصدخانے میں رویت ہلال کی اور ظہور و خفائے کواکب اور طلوع و غروب منازل قمر کے حساب کرنے کی حاجت نہیں رہی کیونکہ دوربین کی مدد سے یہ سب چیزیں دن کو آنکھوں سے دیکھ لی جاتی تھیں۔"[2]

راجہ بھی اپنی بنوائی ہوئی دوربینوں کے ذکر کے فوراً بعد کہتا ہے۔

"و در استمرار آنہا ہلال را پیش از آنکہ زمان خروج الشعاع مقرر کردہ اہل تنجیم شود دیدہ می شود۔ و بعد از آنکہ در حد مقرری اختفا داخل شدہ باشد و کچندے مرئی می باشد، و ہمیں حال است در ظہور و خفائے سیارۂ خمسہ باقیہ و طلوع و غروب منازل۔"[3]

اس دوربین کی مدد سے بڑے اہم عجائبات فلکی کا انکشاف ہوا، جن کا قدما کی کتابوں میں ذکر تک نہیں تھا جیسا کہ راجہ کہتا ہے،

"و نیز ہیئت بعضے از کواکب سیارہ و صفات آنہا را مخالف مکتوبی معروف و مشہور یافتیم بچندیں چیز۔"[4]

(۱) زیج محمد شاہی، ورق ۱۸ ظ (۲) آثار الصنادید، ص ۳۲۰ (۳) زیج محمد شاہی، ورق ۱۸ ظ (۴) ایضاً

ان "مخالف کتوبی معروف و مشہور بچندین چیز" یعنی وہی چار عجائب ہیں جن کا مرہٹے نے بدین طور ذکر کیا ہے۔

(۳) یہ بات تسلیم کی گئی کہ زہرہ اور عطارد بھی چاند کی طرح آفتاب سے روشن ہیں اور بدر و ہلال ہوتے ہیں،

(۴) یہ بات مانی گئی کہ زحل گول کروی (Spherical) شکل پر نہیں، بلکہ الیلجی شکل پر ہے،

(۵) مشتری کے گرد چار روشن ستارے قبول کئے گئے، جن کا اقمار (Satalites) مشتری نام ہے،

(۶) آفتاب پر کے نشان مختلف مانے گئے کہ وضعی حرکت سے ایک برس کے قریب دورا پورا کرتے ہیں[1]

راجہ بھی "بچندین چیز" کی تفصیل یوں لکھتا ہے۔

اول آنکہ برأے العین مشاہدہ کردیم کہ زہرہ و عطارد ہم مانند قمر از آفتاب استفادہ نور می کنند، چہ آنہا را دیدیم بسبب قرب و بعد بآفتاب متناقص النور و متزائد النور می گردند۔

دوم۔ آنکہ زحل را می بینم کہ شکل الیلجی دارد یعنی از دو قطر متقاطع بر قوائم او یکے خورد است و دو دیمیں کلاں۔

سوم۔ آنکہ بر حول مشتری قریب بمسامتہ منطقہ اش چار کواکب روشن یافتہ ایم کہ بر حول مشتری می گردند۔

چہارم۔ آنکہ بر سطح جرم آفتاب چند نشان مختلف دیدیم کہ بحرکت وضعی شمس

---

[1] آثار الصنادید۔ ص ۳۲۰

در مکان خویش در قریب یکسال دورہ تمام می کنند"[1]

قدماء نے کواکب کو دو قسموں میں تقسیم کیا تھا۔ ثوابت (Fixed Stars) اور سیارات، (Planets) ثوابت کے متعلق خیال تھا کہ یہ اپنی وضع تبدیل نہیں کرتے (نیز ایک دوسرے کی نسبت سے حرکت بھی نہیں کرتے) مگر سر سید کا یہ قول کہ کواکب ثوابت در حقیقت ثوابت نہیں ہیں، بلکہ ان میں سے اکثر سیارہ ہیں" راجہ جے سنگھ کے اس قول کا اعادہ ہے، جو اُس نے "زیج محمد شاہی" کے "خاتمہ مقالہ سوم" کی ساتویں فصل میں لکھا ہے:۔

"کوکبے کہ آنہا در عرف منجمین ثوابت گویند، اینہا در حقیقت ثابتہ نیستند، و آنکہ حرکت جمیع اینہا یک مقدار نیست، بلکہ اختلاف دارند"[2]

علم الہیئت کا ایک اہم مقصد اجرام سماوی کی سیر و گردش کا انضباط ہے یونانی، اسلامی علم الہیئت نے اس مسئلہ کو اس طرح حل کیا کہ زمین کو کائنات کا مرکز اور ساکن مانا جس کے گرد مختلف سیارے اپنے اپنے افلاک میں حرکت کرتے ہیں، مگر یہ حرکت کبھی سریع اور کبھی بطئی پائی گئی، نیز کبھی آگے (استقامت) اور کبھی پیچھے (رجعت)۔ اس اشکال کے رفع کرنے کے لئے ہر فلک کلی کو متعدد افلاک جزئیہ سے مرکب مانا گیا جن میں سے بعض کا مرکز زمین ہے (ممثل وغیرہ) اور بعض کا اُس سے الگ کہیں (خوارج) پھر بعض سیارے ایک اور چھوٹے فلک (تدویر) میں مرکوز ہیں، جس کی گردش دوری سے وہ متحرک نظر آتا ہے، اور یہ تدویر کسی بڑے فلک جزئی میں واقع ہے، جو اپنے مرکز کے گرد حرکت کرتا ہے (حوامل و مائل وغیرہ) اس طرح ان مختلف افلاک جزئیہ کی حرکات کے

---

[1] زیج محمد شاہی، ورق ۱۰۱ ظ [2] ایضاً ۹۲ ب

مجموعی نتیجہ سے جو حرکت پیدا ہوتی ہے، وہ اُس سیارے کی حرکت مرئی ہے،

خوارج وتداویر پر مشتمل یہ پیچیدہ نظام، بطلیموسی نظام ہیئت کہلاتا تھا، جو یونانی قدیم کے علاوہ مسلمان ہیئت دانوں کا بھی معمول یہ تھا، مسلمانوں کی تقلید میں قرون وسطیٰ کے یورپی فضلائے ہیئت بھی کوپرنیکس کے زمانہ سے پہلے تک اسی بطلیموسی نظام ہیئت کے قائل وعامل رہے۔

کوپرنیکس نے اس نظام ہیئت کی بنیاد ڈالی جو اس کے نام پر کوپرنیکی نظام ہیئت کہلاتا ہے، اور جو شمس مرکزی نظریہ (Helio-Centric Theory) کی اساس پر قائم ہے، اس کا کہنا ہے کہ آفتاب یا خمسہ متحیرہ زمین کے گرد چکر نہیں لگاتے. بلکہ خود زمین اور یہ پانچوں سیارے (زحل، مشتری، مریخ، زہرہ اور عطارد) آفتاب کے گرد گردش کرتے ہیں،

بعد میں اس کوپرنیکی نظام کو کیپلر اور نیوٹن نے اپنے اپنے قوانین کی بنیاد پر استوار کیا، قدماء صرف "حرکت دائری" کے قائل تھے، یعنی اجرام سماوی کی گردش کا مدار دائرہ کا محیط ہوتا ہے، مگر کیپلر نے کہا کہ زمین اور اسی طرح دیگر سیارے آفتاب کے گرد جس مدار پر حرکت کرتے ہیں، وہ دائری (Circular) نہیں بلکہ بیضی (Elliptical) ہے. نیز سیارہ اس بیضی مدار پر متشابہ زاویائی حرکت (Uniform Angular velocity) کے ساتھ گردش نہیں کرتا بلکہ متشابہ رقبئی حرکت (Uniform Areal velocity) کے ساتھ گردش کرتا ہے،

مگر جیسا کہ جی. آر. کاے کتاب[1] راجہ جے سنگھ اور رصدگاہ محمد شاہی کے

---

[1] G.R. Kaye P 89

دیگر کارکن اس انکشاف سے اس وقت واقف ہوئے، جب وہ اپنے ہیئتی منصوبہ کو مکمل کر چکے تھے، اب نہ تو راجہ جے سنگھ کو اپنی سیاسی ریشہ دوانیوں اور خفیہ سازشوں سے اتنی فرصت تھی کہ رصدگاہ کی ہفت سالہ کاوشوں کو تقویم پارینہ بنا کر کوپرنیکس کے شمس مرکزی نظریہ اور کیپلر کے اس قانون حرکت کی بنیاد پر ہیئتی جداول کو از سر نو مرتب کرتا، اور نہ اُس کے رفقائے کار بھی جن کے دل و دماغ میں ارسطاطالیسی طبیعیات اور اُس کا ارض مرکزی نظریہ علوم متعارفہ بنکر راسخ ہو چکے تھے، کوپرنیکی نظام کے اس انقلاب آفریں نظریہ کو ماننے کے لئے تیار تھے، البتہ کیپلر کا یہ قانون کہ ان اجرام سماوی کا مدار دائری کے بجائے بیضی ہوتا ہے، درخور اعتنا سمجھا گیا، اور اس پر جو تجربہ کیا گیا وہ اطمینان بخش بھی ثابت ہوا، چنانچہ مولوی غلام حسین جونپوری نے جامع بہادر خانی" میں لکھا ہے ا۔

"جمہور راصدان متقدمین واکثر متاخرین مدار خارج المرکز را دائرہ قرار دادہ اند وباعتبار آن تعدیلات جزدی استخراج کردہ اند۔

و مرزا خیر اللہ مہندس در شرح زیج محمد شاہی دعویٰ فرمودہ است کہ ما مدار خارج المرکز شمس بلکہ مدارات جمیع حوامل را بشکل بیضوی یافتہ ایم بدلیلے کہ ہرگاہ تقویم شمسی وکواکب را مطابق تعدیل دائرہ محسوب می کنیم آنرا موافق مرصود نمی یابیم بخلاف آنکہ تعدیلے کہ بمقتضائے بیضوی بر می آید وازاں محاسبہ تقویم می کنیم، آن تقویم بیشتر مطابق مرصود می باشد۔

پس قاعدہ تنا کس دال است کہ مدار بیضوی می باشد"[1]

---

[1] جامع بہادر خانی. ص ۹ ۸ ۲۔

غالباً مرزا خیراللہ مہندس ہی کی تلقین سے راجہ جے سنگھ بھی اس نئے تجربہ کا قائل ہوگیا چنانچہ کہتا ہے۔

این خواہان تحقیق خواست کہ آنچہ بتدقیق از روئے رصد یافتہ، مطابق آن شکلہا ہم درست کردہ شود اول باید دانست کہ مدار خارج المرکز آفتاب را رصد کردن بشکل محیط سطح بیضی معلوم شدہ۔[1]

اور جدید علم الہیئت کے جن تصورات نے راجہ جے سنگھ اور اُس کے رفقائے کار کو متاثر کیا، سرسید نے ان میں سرفہرست اسی اثر کو بیان کیا ہے۔

(۱) مدار خارج مرکز شمسی کو بیضی تسلیم کیا۔[2]

سرسید نے دوسرا اثر یہ بتایا تھا کہ چاند بھی بیضی مدار پر حرکت کرتا ہے۔

(۲) چاند کی حرکتوں کو بیضی مدار پر مانا۔[3]

اس اثر کے باب میں سرسید کا ماخذ زیج محمد شاہی کی حسب ذیل عبارت ہے[4]

مخفی نماند کہ برائے استخراج تعادیل اربعہ قمر از مرکز زمین فرض کنیم کہ بیضی حال صدم مدار مرکز جرم قمر است۔[5] (باقی)

---

[1] زیج محمد شاہی، ورق ۷۶ ظ [2] سرسید احمد خان، آثار الصنادید ص ۳۲۰ [3] ایضاً
[4] زیج محمد شاہی۔ مقالہ سوم باب دوم فصل دوم، مخطوطہ ذخیرہ یونیورسٹی مولانا آزاد لائبریری نمبر ۳۰ ورق ۷۵ ب

حکمائے اسلام حصہ اول و دوم

پہلے حصہ میں پانچویں صدی ہجری تک کے اسلام کے حکما کے حالات و فلسفیانہ کارنامے بیان کئے گئے ہیں اور دوسرے حصہ میں چھٹی صدی ہجری سے لے کر خاندان خیرآباد و فرنگی محل تک کے تمام مشہور مسلمان فلاسفہ کے حالات انکے کارنامے تحریر کئے گئے ہیں۔ مولفہ مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم۔ قیمت، اول ۶۰-۵۰ دوم ۹۵-۱۰

حافظ سخاوی

منصور نعمانی ندوی رفیق دارالمصنفین

(۲)

بعض ہم عصر علما سے اختلافات

معاصرین کے درمیان چشمک مشہور ہے ہر دور میں اسکی مثالیں ملتی ہیں پھر تعجب کیا ہے اگر حافظ سخاوی کو اس سے دوچار ہونا پڑا، رائے کے اختلاف سے ناگواری کا آغاز ہوتا ہے، حاشیہ نشین اسے ہوا دیتے ہیں، اور رفتہ رفتہ دلوں میں گرہیں پڑ جاتی ہیں یہی حال علامہ سیوطی اور سخاوی کا ہوا، ان سے سخاوی کے تعلقات نہایت کشیدہ ہوگئے تھے، دونوں نے ایک دوسرے کے خلاف سخت الفاظ میں اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے، حافظ سیوطی نے "الکاوی علی رأس السخاوی"[1] حافظ سخاوی کے خلاف ایک سخت تنقیدی رسالہ لکھا اس فضا میں سخاوی بھی ضبط و تحمل نہ کر سکے اور الضوء اللامع میں سیوطی کا ذکر نا مناسب الفاظ میں کیا لیکن سخاوی نے سیوطی کے رسالہ کا خود جواب نہیں دیا، بلکہ ان کی حمایت میں مشہور ادیب اور شاعر ابن العلیف احمد بن الحسین المکی نے "الشہاب الهاوی علی منشئ والکاوی، اور المنتقد اللوذعی علی المجتهد المدعی کے نام سے دو کتابیں لکھیں

---

[1] سخاوی کے رد میں سیوطی کے اس رسالہ کا نام فیض الباری (جلد ۴ ص ۳۶۶) میں "الکاوی علی، راس السخاوی" ہے، معجم المطبوعات (جلد ا ص ۱۰۱۳) میں "الکاوی فی تاریخ السخاوی" ہے، البدر الطالع (جلد ۲ ص ۳۳۲) پر "الکاوی فی الرد علی السخاوی" اور دوسری جگہ (ص ۳۲۹) پر "الکاوی لدماغ السخاوی" درج ہے، ذیل تذکرۃ الحفاظ (صفحہ ۸) پر "الکاوی فی الرد علی السخاوی" ملتا ہے

لیکن معاصرانہ ادر قدح کے باوجود سخاوی اور سیوطی دونوں کی علمی اور اسلامی
خدمات ناقابل فراموش ہیں بقول مورخ عیدروسی
"سخاوی اگر علل حدیث کی معرفت میں بے نظیر تھے تو سیوطی حفظ متون میں
بے مثال تھے[1]"

سخاوی کا مسلک | مصر کے مشاہیر علما، اور ائمہ اکثر شافعی مسلک کے تھے، اور یہ کوئی
تعجب انگیز بات نہیں ہے، امام شافعی کی زندگی کا بڑا حصہ مصر ہی میں گزرا یہیں
انھوں نے وفات پائی، اور یہیں ان کے نامور شاگردوں نے فقہ شافعی کی تدوین
کی اور شافعی اساتذہ اور شیوخ کے حلقہ ہائے درس صدیوں اس سرزمین پر قائم
رہے، اس بنا پر یہاں شافعی مسلک کا رواج زیادہ ہوگیا، اور کوئی دوسرا
فقہی مذہب یہ حیثیت نہ حاصل کرسکا آج تک یہی حال ہے، ماحول اور تعلیم
وتربیت کے اثر سے سخاوی نے بھی شافعی مسلک اختیار کیا، حافظ ابن حجر کی
صحبت نے ان کے علم وفضل میں اضافہ کیا، اور ان کی شخصیت اہل کمال کا مرجع
بن گئی، شوافع کے علاوہ احناف بھی انھیں قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں،

وفات | حافظ سخاوی کا آفتاب حیات دنیائے علم وعمل کو کامل ۷۱ برس تک
منور رکھنے کے بعد بالآخر ۲۸ شعبان ۹۰۲ھ (۱۴۹۷ء) کو اتوار کے دن ہمیشہ
کے لیے غروب ہوگیا[2]، انتقال کے وقت ۷۱ سال کی عمر تھی[3]، نماز جنازہ دوسرے
دن فجر کے بعد روضۂ نبوی کے قریب ادا کی گئی، اور جنت البقیع میں امام مالک
کی قبر کے پہلو میں آغوش رحمت کے سپرد کیے گئے۔ عیدروسی آگے لکھتے ہیں۔

---

[1] النور السافر ص۱۸ [2] النور السافر، الضوء اللامع ۸/۳۱ [3] النور السافر ص۱۶ [4] ایضاً

وکانت جنازتہ حافلۃ	ان کے جنازہ میں بڑا اژدہام
ولم یخلفہ بعد مثلہ	تھا، ان کے بعد کوئی ان کا جیسا
فی مجموع فنونہ[4]	جامع الفنون ان کا جانشین نہ ہوسکا

نواب سید صدیق حسن خاں مرحوم نے اتحاف النبلاء میں سخاوی کا سن وفات
۸۶۰ھ[1] تحریر کردیا ہے، جو شاید سہو قلم ہے، کیونکہ موصوف نے اپنی دوسری
کتاب "التاج المکلل" میں صحیح سن وفات ۹۰۲ھ درج کیا ہے،
جرجی زیدان نے نہ معلوم کس ماخذ کی بنیاد پر مقام وفات قاہرہ لکھ دیا ہے[2]
صحیح بات وہی ہے، جو صاحب النور السافر اور دیگر تذکرہ نگاروں نے لکھی ہے۔

تلامذہ | حافظ سخاوی نے یگانۂ روزگار فضلا سے کسب فیض کیا تھا، اور وہ خود فن حدیث
کے علاوہ دوسرے علوم میں نہایت بلند درجہ پر فائز تھے، نیز ان کے علم وکمال اور درس
حدیث کی دور دور شہرت تھی، قاہرہ ان کی علمی سرگرمیوں کا خاص مرکز تھا، اسکے
علاوہ انھوں نے مدت مدید تک حرمین شریفین میں بھی مسند درس وتدریس آراستہ کی
اس طرح ان کے چشمۂ فیض سے ہزاروں تشنگان علم سیراب ہوئے، ذیل میں حافظ سخاوی
کے چند نامور تلامذہ کا تذکرہ درج ہے۔

جاراللہ بن فہد | محمد نام، ابوالفضل کنیت، محب الدین لقب اور جاراللہ عرف ہے،
پورا سلسلۂ نسب یہ ہے محمد بن عبدالعزیز عمر بن محمد بن فہد الہاشمی المکی الشافعی[3]، وہ
اپنے اسلاف ہی کی طرح ابن فہد کے نام سے مشہور ہوئے[4]، ۲۰ رجب ۸۹۱ھ کو مکہ مکرمہ میں

---

[1] اتحاف النبلاء ص۲۷ [2] تاریخ آداب اللغۃ العربیہ ۳/۱۶۹ [3] ذیل تذکرۃ الحفاظ ص ۳۸۱ [4] النور السافر ص۲۴۱

پیدا ہوئے، اور اپنے والدین سے ابتدائی تعلیم حاصل کی بچپن میں ہی قرآن حفظ کیا، ان کو
نووی کی کتاب المنہاج اور کتاب الاربعین بھی زبانی یاد تھی[1]۔ ابن فہد کو شیخ عبداللہ ابا کثیر
شیخ شہاب الدین البسیری، شیخ زکریا انصاری، محب طبری، اور حافظ سخاوی وغیرہ
سے حدیث کے سماع کا شرف حاصل ہے[2]، حافظ سخاوی سے مجاورت مکہ کے زمانہ میں
بڑا استفادہ کیا، وہ جب چوتھی دفعہ مکہ معظمہ تشریف لے گئے تو ابن فہد نے ان کی خدمت
میں حاضر ہو کر سماع کیا[3] اور پھر سخاوی کے دامن فیض سے ان کی زندگی بھر وابستہ رہے،
ابن فہد کو حافظ سخاوی سے بڑا تعلق تھا، اور وہ ان کے کمالات اور علمی تبحر کے پوری طرح
معترف تھے، ان کا بیان ہے کہ "خدائے بزرگ و برتر کی قسم میں نے متاخرین حفاظ حدیث
میں ان کے جیسا صاحب کمال نہیں دیکھا[4]، وہ بھی اپنے استاذ ہی کی طرح عرصہ تک
مکہ مکرمہ میں مسند حدیث آراستہ کئے رہے، ۹۵۴ھ میں ان کا انتقال ہوا[5]۔

قسطلانی | یہ بلند پایہ محدث اور صحیح بخاری کے مشہور شارح، انھوں نے زکریا انصاری
اور حافظ سخاوی سے استفادہ کیا، صاحب النور السافر کا بیان ہے کہ "حافظ
سخاوی سے تعلق کے بعد ان کے جوہر کھل گئے، اور انھوں نے متعدد مفید کتابیں
لکھیں، ان کی سب سے اہم کتاب بخاری کی شرح ارشاد الساری ہے، جو دس
ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے، اس کا شمار صحیح بخاری کی عمدہ شرحوں میں ہے[6]، اس کے
علاوہ الاسعاد فی مختصر الارشاد۔ لطائف الاشارات فی عشرات القرات؛
الروض الزاہر فی ترجمۃ عبدالقادر اور المواہب اللدنیہ وغیرہ بھی مشہور ہیں[7]۔

---

[1] شذرات الذہب ۸/۳۰۱ [2] ایضاً [3] ذیل تذکرۃ الحفاظ ص ۳۸۲ [4] النور السافر ص ۲۱۲، [5] شذرات الذہب ۸/۳۰۱ [6] النور السافر ص ۱۱۵ [7] بستان المحدثین بحوالہ انوار الباری دوم ص ۱۶۱

المواہب کے متعلق حاجی خلیفہ لکھتے ہیں: "یہ بلند پایہ اور عمدہ کتاب اپنے موضوع پر بے نظیر
ہے[1]، صاحب النور السافر نے بھی اس کو بے نظیر اور بلند پایہ کتاب بتایا ہے[2]، علامہ زرقانی
المتوفی ۱۱۲۲ھ نے اس کی بہت ضخیم شرح لکھی تھی، جو شرح زرقانی کے نام سے
آٹھ جلدوں میں ۱۳۲۸ھ میں مصر سے طبع ہو چکی ہے[3]۔

حافظ سیوطی ان کے ہم عصر تھے ان کا خیال ہے کہ قسطلانی ان کی کتابوں سے نقل
و استفادہ کر کے اپنی طرف منسوب کر لیتے ہیں، اس کے متعلق جب انھوں نے
شیخ زکریا انصاری سے رجوع کیا تو انھوں نے مصالحت کرا دی، لیکن پھر بھی سیوطی کا دل
ان کی طرف سے صاف نہیں ہوا، وہ روضۃ المقیاس میں گوشہ نشین تھے، قسطلانی نے
آکر ان کے مکان پر دستک دی، انھوں نے دریافت کیا کون ہے؟ قسطلانی نے جواب دیا
کہ میں قاہرہ سے برہنہ پا آیا ہوں، تاکہ آپ کا دل میری جانب سے صاف ہو جائے،
سیوطی نے دروازہ کھولے اور ملاقات کئے بغیر ہی اندر سے جواب دیا کہ میرے دل میں
تمھاری طرف سے کوئی میل نہیں ہے[4]۔

قسطلانی کو حدیث سے بڑا شغف تھا، ان کا سب سے بڑا کارنامہ ارشاد الساری
ہے، یہ عمدۃ القاری اور فتح الباری کا نچوڑ و خلاصہ ہے، ۹۲۳ھ میں قاہرہ میں وفات
پائی، اور جامع ازہر میں جمعہ کی نماز کے بعد ان کے جنازہ کی نماز ادا کی گئی، اور مدرسہ
عینیہ کے متصل ان کو سپرد خاک کیا گیا[5]۔

ابن عبدالسلام | پورا سلسلۂ نسب یہ ہے، احمد بن محمد بن عبدالسلام ابن موسیٰ

---

[1] النور السافر ص ۱۱۵ [2] بحوالہ فوائد جامعہ ص ۱۵۳ [3] النور السافر ص ۱۱۵ [4] کشف الظنون ۲/۱۸۹۶ [5] شذرات الذہب ۸/۱۲۳؛ النور السافر ص ۱۱۳-۱۱۴

الشہاب ابو الخیر بن العز المنوفی الاصل، ابن عبد السلام کی عرفیت سے مشہور ہوئے، یہ منوف (قاہرہ کی ایک بستی) کے رہنے والے تھے، لیکن قاہرہ کو مستقل وطن بنالیا تھا، منوف کے قاضی بھی رہے، حافظ سخاوی کے ارشد تلامذہ میں تھے، سخاوی نے انکے حالات میں لکھا ہے کہ ۴ ربیع الاول ۸۵۰ھ کو بعد نماز جمعہ ولادت ہوئی بچپن ہی میں قرآن پاک حفظ کیا، اور عمدۃ المنہاج از الفیہ مالک کو حفظ کیا مجھ سے حدیث کی بہت سی کتابیں پڑھیں، اور حدیث کا علم مجھ ہی سے حاصل کیا، مختصر ابی شجاع لکھی اور اپنے شیخ بکری کے فتاوی مرتب کئے، اور نیل پر ایک کتاب لکھی، حج بھی کیا، اور مجاورت حرمین اختیار کی، برہان ابن ظہیرہ کے درس میں بھی حاضری دی، اور انہی کے اشارہ پر ان کے فتاوی کو جمع کیا، نظم ونثر سے انکو خاص مناسبت تھی، انھوں نے بہت سے قصائد لکھے، غالباً ابھی تک انکی کوئی کتاب زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوسکی ہے مگر "لطیف المدینی اخبار النیل" کا فرانسیسی ترجمہ دلاب بارحبس نے کیا ہے، جو آسوی جریدہ (جورنال اساتیک) میں ۱۸۳۷ء و ۱۸۴۰ء و ۱۸۴۶ء میں چھپا، ان کا دوسرا بڑا کارنامہ البدر الطالع ہے، جو اپنے استاذ کی شہرہ آفاق کتاب الضوء اللامع کا اختصار ہے، یہ بھی ابھی تک زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوسکا ہے[3]

ان کا انتقال ۹۳۱ھ میں ہوا[4]

المواہبی | یہ مشہور صاحب دل بزرگ اور عالم تھے، ان کا نام برہان الدین ابو الطیب ابراہیم بن محمد بن احمد بن حسن القصرائی الشافعی المواہبی ہے، ان کو بھی سخاوی اور دوسرے ارباب کمال سے استفادہ کا موقع ملا، قاہرہ میں انکی خانقاہ مرجع خ

۱ الضوء اللامع ۲/ ۱۰۲ ۲ ایضاً ۳ الاعلام زرکلی ۱/ ۱۰۰ ۴ کشف الظنون

تھی، اور متعدد اصحاب نے ان سے تصوف وسلوک کی تحصیل کی، تصوف وسلوک کی تحصیل ابن المغربی سے کی تھی، اور ان کی اجازت سے مشہور عارف باللہ محمد ابی المواہب التونسی سے بھی کسب فیض کیا، سخاوی نے بھی ان کا مختصر تذکرہ لکھا ہے[1]

جار اللہ بن فہد کا بیان ہے کہ "وہ ۹۰۲ھ میں مکہ آئے اور تین سال مسلسل قیام کیا، اور ابن عطاء اللہ کی الحکم کی شرح احکام الحکم لشرح الحکم کے نام سے لکھی، اور ایک شرح اصول مقدمات الاصول کے نام سے لکھی، رسالہ سنوسیہ فی اصول الدین کی بھی شرح لکھی نظم میں ایک دیوان اور متعدد رسائل ان کی یادگار ہیں،

سیوطی کا تلمذ | حافظ سخاوی عمر میں سیوطی سے بڑے تھے، یہ ان کے یہاں اکثر آتے رہتے تھے، اس سے گمان ہوتا ہے، کہ انھوں نے سخاوی سے استفادہ بھی ضرور کیا ہوگا، یہ دونوں بزرگ ایک دوسرے کے علم وفضل کے معترف بھی تھے،

علامہ سیوطی نے ان کے متعلق بعض قصیدے بھی لکھے تھے، سخاوی ان کے والد ابو بکر کے تذکرہ مین لکھتے ہیں۔

وھو والد الفاضل جلال الدین عبد الرحمن أحد من اکثر من التردد علی و مدحنی نظماً ونثراً انفع اللہ بہ[3]

(یہ ابو بکر) فاضل جلال الدین عبد الرحمن کے والد ہیں، جلال الدین ان لوگون میں سے ہیں، جنکی میرے پاس بہت آمد ورفت رہی، انھون نے نظم ونثر میں میری

۱ النور السافر ص ۵۰ ۲ ایضاً ۳ الضوء اللامع ۴/ ۶۶

لیکن اس استفادہ کو تلمذ نہیں کہا جا سکتا بلکہ اس کی حیثیت باہمی افادہ واستفادہ کی ہے اسی لئے کسی تذکرہ نگار نے سیوطی کو سخاوی کے تلامذہ میں شمار کیا ہے اور نہ خود سیوطی نے بھی ان کو اپنے اساتذہ میں شامل کیا ہے،

سیوطی نے بغیۃ الوعاۃ میں ایک جگہ ان کو "صاحبنا" ضرور لکھا ہے، اس کے متعلق صاحب فہرس الفہارس والاثبات سید عبدالحی کتانی لکھتے ہیں، "نہ سیوطی نے سخاوی سے علوم کی تحصیل کی، اور نہ ان کو اپنے شیوخ میں شمار کیا، اور نہ ان کے شاگردوں نے جن سے میں واقف ہوں، البتہ بغیۃ الوعاۃ میں ایک جگہ میں نے سیوطی کے قلم سے یہ لکھا ہوا دیکھا ہے، کہ میں نے ہمارے صاحب (یعنی شیخ) محدث سخاوی کے قلم سے (ایسا) لکھا ہوا دیکھا ہے۔ ملاحظہ ہو، کتاب مذکور کا صفحہ ۳۱۳ اس موقع پر سیوطی نے ان کو اپنے شیوخ میں شمار کیا ہے[1] مگر یہ قرین قیاس نہیں، کیونکہ عربی زبان میں "صاحب" کا لفظ جس طرح استاد کے لیے، بولا جاتا ہے، اسی طرح اس کا اطلاق شاگرد، ہم درس خواجہ طاش، اور رفیق وغیرہ کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے، اس بنا پر ان کو سخاوی کا شاگرد نہیں کہا جاسکتا ان دونوں میں معاصرت تھی، جو ان کی منافرت کا سبب ہے، سخاوی نے سیوطی کا تذکرہ مناسب انداز میں نہیں کیا ہے، اور سیوطی نے بھی ایک رسالہ لکھ کر ان پر طعن وتشنیع کا اظہار کیا ہے، ایسی صورت میں تلمذ کی روایت بالکل صحیح نہیں معلوم ہوتی۔

---

[1] فہرس الفہارس ۳۵۵/۲

سخاوی کا فیض ہندوستان میں

سخاوی کے عرب شاگردوں کا ذکر سطور بالا میں ہو چکا ہے ان کے چشمہ فیض کے کچھ سوتے ہندوستان میں بھی پھوٹے اور اس سرزمین کو احادیث نبوی کے گل بوٹوں سے رشک مصر وشام کر دیا۔

علامہ سید سلیمان ندوی رقمطراز ہیں،

"علم حدیث کے ہندوستان میں فروغ کا حقیقی زمانہ نویں صدی کا خاتمہ اور دسویں صدی کا آغاز ہے، یہ وہ عہد تھا، جب مصر وشام وحجاز میں امام حدیث حافظ محمد بن عبدالرحمن سخاوی کے فضل وکمال کا آفتاب نصف النہار پر تھا، اور حافظ موصوف کے فیض وافادہ کی کرنیں دنیائے اسلام کے ہر گوشہ پر پڑ رہی تھیں، مدینہ منورہ میں آکر ان کے کمال نے نورٌ علی نور کا مرتبہ حاصل کیا، ہندوستان کے مختلف صوبوں میں سب سے پہلے گجرات نے اپنا طبعی حق پایا، یعنی بحر عرب کے اس پار کی شعاعیں سب سے پہلے یہیں آکر پڑیں، اور یہاں سے وہ آگرہ کی مسجدوں اور مدرسوں کے مناروں پر جاکر عکس انداز ہوئیں"[1]

مولانا مناظر احسن گیلانی نے بھی اس کی تائید ان الفاظ میں کی ہے،

" حافظ ابن حجر کے خلیفہ اکبر علامہ سخاوی کے ایک نہیں متعدد شاگردوں نے ہندوستان کو اپنا وطن بنایا، اور جیتے جی اس ملک میں حدیث کا درس دیتے رہے"[2]

چند ممتاز ہندوستانی شاگرد

ذیل میں حافظ سخاوی کے کچھ ممتاز ہندوستانی تلامذہ کا تذکرہ کیا جاتا ہے،

راجح بن داؤد احمد آبادی

یہ حافظ سخاوی کے سب سے پہلے ہندوستانی شاگرد ہیں،

---

[1] مقالات سلیمان ج ۲ ص ۱۰ [2] ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت اول ص ۱۵۹

جنھوں نے حرمین میں ان سے کسب فیض کیا، پھر ہندوستان واپس آکر گجرات میں حدیث کی شمع روشن کی، ان کی علمی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ خود ان کے عظیم المرتبت استاذ نے الضوء اللامع میں انکا تذکرہ اچھے الفاظ میں کیا ہے،

"راجح ۹ر صفر ۸۱۱ھ میں احمد آباد میں پیدا ہوئے اور وہاں یتیمی کی حالت میں پروان چڑھے، اپنے وطن کے مشہور اساتذۂ فن سے علوم متداولہ کی تحصیل کی۔ معانی و بیان مخدوم ابن برہان سے اور ہیئت و کلام کا درس محمد بن تاج حنفی سے لیا علمی فضل و کمال کے ساتھ شعر و سخن کا بھی پاکیزہ ذوق تھا، مجھ سے ۸۹۶ھ میں ان کی ملاقات ہوئی، میں نے ان کو النخبۃ الحدیث کی شرح پڑھائی، اور سند اجازہ عطا کی[1]"

تحصیل علم کے بعد وہ گجرات چلے آئے جہاں آخر عمر تک درس و افادہ میں مشغول رہے، ۹۰۴ھ میں وفات پائی[2] مولانا عبدالحی نے بھی انکے کمال کا اعتراف کیا ہے[3]

سخاوی نے راجح کے والد داؤد کا بھی مختصر تذکرہ لکھا ہے، اس میں احمد آبادی کو سہو قلم سے محمد آبادی لکھ دیا ہے، راجح کے والد کی وفات ۸۶۲ھ میں ہوئی،[4]

سلیمان بن محمد احمد آبادی یہ راجح کے چچا تھے، سن ولادت ۸۴۰ھ ہے، سخاوی نے الضوء اللامع میں ان کا تذکرہ بھی کیا ہے، اور لکھا ہے "وہ مختلف علوم و فنون کے جامع تھے، انھوں نے ۸۹۴ھ میں شرح الفیہ کا ایک حصہ لکھنے میں میری مدد کی اور اسی دوران اس کو مجھ سے پڑھا بھی وہ مجھ سے کئی مرتبہ ملے،[5]"

---

[1] الضوء اللامع ۳/۲۲۲، [2] نزہۃ الخواطر ۴/۱۱۱، [3] یاد ایام ص ۶۲
[4] الضوء اللامع ۳/۲۱۶ [5] ایضاً ۳/۲۶۰

شیخ محمد بن محمد المالکی المصری یہ اصلاً عرب نژاد تھے، مصر میں پیدا ہوئے، اور وہیں نشو و نما پائی، لیکن تحصیل علم کے بعد ہندوستان آکر گجرات میں درس و افادہ کی مجلس گرم کی، غیر معمولی تبحر علم، مہارت حدیث اور زہد و اتقا کے باعث سلطان گجرات ان کا بڑا قدرداں تھا، اور اعتراف کمال کے طور پر ان کو ملک المحدثین کا خطاب عطا کیا،

صاحب النور السافر نے لکھا ہے کہ "شیخ محمد اپنے اسلاف کی طرح ابن سوید کی کنیت سے مشہور تھے، ۹ر شعبان ۸۵۶ھ کو پیدا ہوئے، والد کے زیر سایہ پروان چڑھے، مختلف علوم و فنون کی تحصیل کے ساتھ حفظ قرآن کی دولت سے بھی مالامال ہوئے، انھوں نے مکہ میں جہاں حافظ سخاوی کا فیضان جاری تھا، حاضر ہو کر ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا تھا، اور موطا، مسند شافعی، سنن ابن ماجہ، اور جامع ترمذی کے علاوہ بہت سی کتابیں ان سے پڑھیں، اور ایک طویل مدت ان کے دامن فیض سے وابستہ رہے[1]"

سخاویؒ نے اپنے اس لائق شاگرد کے حالات اس طرح بیان کئے ہیں،

"شیخ محمد مصری نہایت ذہین شخص ہیں، علم کا غایت درجہ استحضار ہے[2]"

اسی طرح شیخ جار اللہ ابن فہد رقمطراز ہیں کہ "شیخ محمد نے ہندوستان میں ممتاز مقام حاصل کیا، اور وہاں کے حکمراں محمد شاہ (گجراتی) نے ان کو ملک المحدثین کے لقب سے سرفراز کیا، اس لقب سے سرفراز ہونے والے وہ پہلے شخص ہیں، سلطان مذکور کی اس قدردانی کے بعد ان کی مرجعیت میں مزید اضافہ ہو گیا تھا، اکابر اہل علم

---

[1] النور السافر بحوالہ نزہۃ الخواطر ۴/۳۱۴ [2] الضوء اللامع، نزہۃ الخواطر ۴/۳۱۴

ان کے تبحر علمی کا اعتراف کیا ہے، سلطان مذکور کی حیات تک شیخ کا حلقہ درس اس شان مقبولیت کے ساتھ قال اللہ وقال الرسول کے نغموں سے گونجتا رہا لیکن اس کی وفات کے بعد جب سلطان مظفر شاہ تخت نشین ہوا تو بعض وزرار اور حاسدوں کی ریشہ دوانیوں کے باعث ان کو آلام ومصائب کا سامنا کرنا پڑا، اور بالآخر ۹۲۹ھ میں حدیث کی یہ روشن شمع احمدآباد میں گل ہوگئی، [1]

علامہ بحرق

ان کا شمار بھی ان علماء میں ہوتا ہے جو ہندی الاصل تو نہ تھے لیکن خود کو اہل ہند کی علمی خدمت کے لئے وقف کر دیا تھا، اور گجرات میں مستقل سکونت اختیار کرلی تھی، ان کا اصل نام شیخ جمال الدین محمد بن عمر بن مبارک ہے، لیکن بحرق کے نام سے شہرت پائی، [2]

۸۶۹ھ میں حضرموت میں پیدا ہوئے، مقامی اساتذہ سے استفادہ کرنے کے بعد دوسرے ملکوں کے مشاہیر سے بھی اکتساب فیض کیا، ۸۹۴ھ میں مکہ معظمہ میں حاضر ہوکر حافظ سخاوی سے حدیث کی تحصیل کی، [3] حدیث وتفسیر، نحو وصرف تصوف وادب اور حساب وطب وغیرہ میں کامل درک رکھتے تھے، نظم ونثر دونوں پر یکساں عبور حاصل تھا، عیدروسی نے لکھا ہے کہ "میں نے علماء حضرموت میں ان سے زیادہ جامع اور بلاغت وفصاحت کا پیکر نہیں دیکھا، ان کی تصانیف سے ان کی دقت نظری اور تبحر علمی کا پورا اندازہ ہوجاتا ہے، [4] وہ ایک بلندپایہ شاعر بھی تھے، جس کے متعدد نمونے صاحب النور السافر نے نقل کئے ہیں، علامہ

---

[1] ظفر الوالہ اول ص ۱۱۱-۱۱۸ [2] النور السافر ص ۱۴۴ [3] ظفر الوالہ اول ص ۱۱۹

[4] النور السافر ص ۴۴،

بحرق سلطان مظفر شاہ گجراتی کے عہد میں ہندوستان آئے، سلطان نے ان کی بڑی قدر افزائی کی، جب وہ ان کے علم وفضل سے واقف ہوا تو غایت درجہ عزت وتکریم سے پیش آیا اور شیخ کو ان کے شایان شان منصب پر فائز کیا، [1]

مولانا سید عبدالحی صاحب نے لکھا ہے کہ "خود مظفر شاہ حلیم نے بھی ان سے تلمذ کی سعادت حاصل کی تھی، [2]

علامہ بحرق نے بکثرت کتابیں تصنیف کی ہیں، عیدروسی نے النور السافر میں ان کی تصانیف کی ایک طویل فہرست درج کی ہے، جن میں قابل ذکر یہ ہیں،

تبصرۃ الحضرۃ الشاہیہ الاحمدیہ، الحسام المسلول علی مبغضی اصحاب الرسول، ترتیب السلوک الی ملک الملوک، متعۃ الاسماع باحکام السماع، مواہب القدوس فی مناقب ابن العیدروس، شرح الملحۃ للحریری، [3]

محدث شیرازی

یہ حافظ سخاوی کے ہندوستانی تلامذہ میں گل سرسبد کی حیثیت رکھتے ہیں، ان کے نور کمال سے ایک عالم روشن ہوا، پورا نام سید رفیع الدین صفوی شیرازی ہے، مکہ جاکر حافظ سخاوی سے حدیث کا درس لیا، پھر گجرات میں وارد ہوئے یہ زمانہ دہلی میں سکندر لودھی جیسے علم دوست بادشاہ کا تھا، اس نے محدث موصوف کی خبر پاکر دہلی بلا بھیجا، اور سلطان کی مرضی سے آگرہ میں سکونت اختیار کی انکے حلقۂ درس میں دور دور سے تشنگان علم کھنچ کھنچ کر آتے تھے، اور اپنی اپنی قسمت کے مطابق متاع خیر وبرکت حاصل کرتے تھے، [4]

---

[1] النور السافر ص ۱۴۷ [2] یاد ایام ص ۴۴ [3] النور السافر ص ۱۴۸،۱۴۹

[4] مقالات سلیمان دوم ص ۱۱،

حدیث وتفسیر وغیرہ دینی علوم کے ساتھ ان کو عقلی علوم میں بڑا مرتبہ حاصل تھا صاحب تذکرہ علمائے ہند نے ان کی ذات کو مجمع البحرین قرار دیا ہے۔[1]

ابوالفضل نے آئین اکبری میں لکھا ہے کہ

درجزیرۂ عرب انواع علوم نقلی از شیخ سخاوی مصری قاہری تلمیذ شیخ ابن حجر عسقلانی برگرفت،[2]	جزیرۂ عرب میں مختلف علوم نقلیہ امام ابن حجر کے تلمیذ رشید، شیخ سخاوی مصری سے حاصل کئے۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اخبار الاخیار میں محدث شیرازی کو خصوصی اعتنا کا مستحق قرار دیتے ہوئے ان کے حالات وکمالات پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے،[3]

سلاطین وقت ان کے غیر معمولی علمی کمالات اور حسن کردار کے باعث انکی بے حد تعظیم وتکریم کرتے تھے، اور امور سلطنت میں ان کے نیک مشوروں پر عمل کرتے انھوں نے سکندر، ابراہیم، بابر، ہمایوں، شیر شاہ، سلیم شاہ چھ حکمرانوں کا زمانہ پایا تھا، اس دوران مختلف قسم کے سیاسی انقلابات کی آندھیوں میں ثابت قدم رہے، مگر شیخ کے ساتھ سلاطین کی عقیدت میں کوئی تزلزل نہیں ہوا اور سبھی ان کی تعظیم وتکریم کرتے رہے، بابر کے ہندوستان فتح کرنے پر اکثر علاقوں کے حاکم ان کی سفارش سے ملازمت شاہی میں داخل ہوئے، ہمایوں جب شیر شاہ سے شکست کھاکر آگرہ آیا تو مشورہ کی غرض سے ان کی خدمت میں حاضر ہوا شیر شاہ کے عہد میں جب انھوں نے وطن واپسی کا ارادہ فرمایا تو اس نے نہایت الحاح ومنت سے ان کو اس سے باز رکھا۔

[1] تذکرہ علماء ہند ص ۶۵ [2] آئین اکبری ۳/۲۰۵ [3] اخبار الاخیار ص ۲۴۲،

ہزاروں علماء وفضلا دور دراز ملکوں سے آکر ان کی خانقاہ میں فروکش ہوتے، بلکہ بعض اوقات تو ان کی سخاوت وسیر چشمی کے باعث اس محلہ میں مستقل طور پر آباد ہو جاتے تھے، یہ خانقاہ مدتوں مرجع انام رہی، اور بندگان خدا علوم ظاہری وباطنی سے فیضیاب ہوتے رہے۔[1]

۹۵۴ھ میں آپ نے وفات پائی، اور خانقاہ ہی کے اندر مدفون ہوئے، پہلے مزار پر ایک وسیع وخوشنما گنبد تھا، لیکن امتداد زمانہ کی بنا پر وہ صورت اب باقی نہیں رہ گئی ہے، ۱۹۲۹ء میں سعید احمد مارہروی مصنف مرقع اکبر آباد نے جب اس قبرستان کا مشاہدہ کیا تو گنبد کی چھت گر چکی تھی، ستون کچھ باقی تھے، پورا قبرستان بڑی خستہ حالت میں تھا،[2] پچاس برس بعد آج اس کی حالت اور خراب ہو چکی ہو گی، اور اب شناخت بھی آسانی سے ممکن نہ ہو گی۔

بوستان اخبار سے شاہ صاحب کے ایک صاحبزادے کا پتہ چلتا ہے، انکا نام سید مرشد الدین تھا، انھوں نے جملہ علوم ظاہری وباطنی کی تحصیل اپنے والد سے کی تھی، اور اوصاف وکمالات میں اپنے والد کا نقش ثانی تھے، آپ بھی اپنے والد کے پہلو میں مدفون ہیں،[3] لیکن اولاد واحفاد کا سلسلہ زیادہ عرصہ تک باقی نہ رہا، شاہ عبدالحق محدث دہلوی المتوفی (۱۰۵۲ھ) نے سید رفیع الدین کی وفات کے تقریباً پچاس برس بعد اخبار الاخیار لکھی تو اہل خاندان میں سے کوئی موجود نہ تھا، شاہ صاحب نے تصریح کی ہے کہ آپ کی اولاد میں سے کوئی بھی ایسا شخص زندہ نہیں ہے، جس کی آپ سے معمولی سی بھی رشتہ داری ہو آپ کے خاندان کا کوئی فرد بھی زندہ نہیں رہا۔[4] (باقی)

[1] بوستان اخیار و مشاہیر اکبر آباد (ص ۱۰۰) [2] مرقع اکبر آباد ص ۱۰۱ [3] بوستان اخیار ص ۲۰۹
[4] اخبار الاخیار ص ۲۳۶

لاہور میں علامہ محمد اقبال کی بین الاقوامی کانگریس کا جشن

از سید صباح الدین عبدالرحمٰن

(۲)

علامہ محمد اقبال کی بین الاقوامی کانگریس میں جن پاکستانی مندوبین سے ملنے کا موقع ملا، ان کا ذکر گزشتہ اشاعت میں ہو چکا ہے، اس اجتماع میں آسٹریلیا، بلجیم، کناڈا، زیکوسلوواکیا، مصر، فن لینڈ، فرانس، انڈونیشیا، ایران، عراق، جاپان، کویت، لبنان، لیبیا، فلپائن، رومانیہ، سری لنکا، سوڈان، سویڈن، سوئٹزرلینڈ، شام، تیونس، ترکی، انگلستان، اٹلی، امریکہ، مغربی جرمنی، اور آئرلینڈ وغیرہ کے نمائندے بھی تھے، زیکوسلوواکیا کے ڈاکٹر جان مارک پراگ میں مشرقی علوم کے استاد ہیں، اردو بھی پڑھاتے ہیں، دہلی میں اقبال پر جو بین الاقوامی سمینار ہوا تھا وہ اس میں بھی شریک ہوئے تھے، اردو بہت اچھی بولتے ہیں، دہلی ہی میں ان سے بے تکلفی ہو گئی تھی، اس لئے لاہور میں ان کی ملاقاتوں میں بڑی گرم جوشی رہی، روم سے پروفیسر الاسنڈرو بوسانی آئے تھے، وہ وہاں اسلامیات کے پروفیسر ہیں، ترک ہیں، لیکن فارسی

اور اردو بھی بولتے ہیں، فارسی میں تو بڑی اچھی تقریر کرتے ہیں، عرب ممالک کے نمائندے اس کانگریس میں اس طرح نمایاں حصہ لیتے ہوئے نظر نہیں آئے، جس طرح بین الاقوامی سیرت کانگریس میں نظر آتے تھے،

اس کانگریس کے لیے بکثرت مقالات آئے تھے، جن کی چار ضخیم جلدیں سائکلو اسٹائل کر کے تمام مندوبین کو پہلے ہی دیدی گئی تھیں، دو اور جلدیں زیر ترتیب تھیں، ہر نمائندہ کو ایک بریف کیس دے دیا گیا تھا، جس کے اندر پروگرام، نمائندوں کے تعارف اور دوسرے ضروری کاغذات کے ساتھ ایک سونے کا تمغہ بھی تھا، جس پر فرسٹ اقبال سنٹری، اور یہ شعر کندہ تھا،

آدمیت احترام آدمی　　　باخبر شو از مقام آدمی

اسی کے ساتھ ایک چھوٹا سا کرسٹ بھی تھا، تاکہ شناخت کے لیے نمائندے اپنے لباس پر لگا سکیں، بریف کیس کے اندر حسب ذیل کتابیں بھی تھیں، (۱) پس چہ باید کرد ..... کا انگریزی ترجمہ جو جناب بشیر احمد ڈار کا کیا ہوا تھا، ان کے متعلق ذکر آچکا ہے کہ وہ اقبالیات کے بہت بڑے ماہروں میں ہیں، (۲) A message from the East از محمد ہادی حسین، (۳) کتابیات اقبال از رفیع الدین ہاشمی، (۴) The Place of God, Man and Universe in the philosophical System of Iqbal از ڈاکٹر جمیلہ خاتون، (۵) ثقافت کا اقبال نمبر (۶) الفلاح کا اقبال نمبر (۷) حصول پاکستان، از پروفیسر احمد سعید اور فارسی جریدہ ہنر و مردم کا اقبال نمبر، ان تحایف کے ساتھ ایک سیاہ رنگ کی جناح کیپ بھی تھی۔

۲۰ دسمبر ۱۹۷۷ء کی صبح سے کانگریس کی کارروائی شروع ہوگئی، تمام نمایندے انٹر کونٹی نینٹل ہوٹل ہی میں ٹھہرائے گئے تھے، اس لئے ناشتے اور کھانے میں ملاقات اور گفتگو کا موقع برابر ملتا رہتا تھا، اپنے یہاں دہلی میں اس کی بڑی کمی محسوس ہوتی تھی اندرون ملک کے نمایندوں کے قیام کا انتظام وہاں نہیں تھا، یہ لوگ ذاتی طور پر جہاں موقع ملا ٹھہر گئے تھے، اس لئے ان کو ایک دوسرے سے بے تکلفانہ ملاقاتوں کا موقع نہیں ملتا تھا، پاکستان میں یکجائی قیام سے تبادلۂ خیالات کا خوب موقع ملتا تھا، ناشتے اور کھانے میں تنوعات تو مسلمانوں کے دسترخوان کی خصوصیت ہے، لیکن پاکستان بہت امیر ملک نہیں، اس لئے اس کی دعوتوں میں عہد ماضی کی امیرانہ شان کے بجائے سادگی کا لحاظ رکھا جائے تو اچھا ہے،

کانگریس کی کارروائی کا آغاز علامہ محمد اقبال کے مزار پہ حاضری سے کیا گیا، جو بادشاہی مسجد کے پھاٹک کے بائیں جانب پر واقع ہے، اس کا تعویذ سنگ مرمر کا ہے، فاتحہ خوانی کا منظر بڑا ہی پر کیف تھا، ٹیلی ویژن کا عملہ اور فوٹوگرافر ہر طرف دوڑ رہے تھے، نمایندے بادشاہی مسجد کے اندر بھی گئے، دہلی کی جامع مسجد میں جو حسن ہے، وہ تو اس میں نہیں ہے، لیکن اب اس کی پوری مرمت کر کے اس کی ہر چیز میں خوش سلیقگی اور نفاست پیدا کر دی گئی ہے، پاکستان کو اب اس مسجد پر اسی طرح ناز ہو سکتا ہے، جس طرح کہ ہندستان کو دہلی کی جامع مسجد پر ہے،

وہاں سے ہم لوگ جاوید منزل آئے، جو علامہ محمد اقبال کی آخری رہائش گاہ تھی، ان کے لڑکے ڈاکٹر جاوید اقبال سے حکومت پاکستان نے اسے خرید لیا ہے، اب یہ ایک میوزیم بن گیا ہے، یہاں وہ میڈل بھی دیکھے جو علامہ اقبال کو میٹرک بی۔ اے اور ایم۔ اے

کے امتحانات میں ملے تھے، وہ سرٹیفکیٹ بھی رکھے ہوئے تھے، جو کیمبرج اور میونخ یونیورسٹیوں سے ان کی ڈگریوں کے سلسلہ میں ملے تھے، پنجاب، علی گڑھ اور الہ آباد یونیورسٹیوں نے ان کو ڈی لٹ کی جو اعزازی ڈگریاں دی تھیں، ان کی سندیں بھی رکھی ہوئی تھیں، ان کے استعمال میں جو فرنیچر تھے، وہ بھی محفوظ کر دیے گئے ہیں، ان میں ایک نیوار کی کھاٹ، ایک ڈریسنگ ٹیبل، ایک صوفہ، تین آرام کرسیاں، دو چھوٹی میزیں، چھ کھانے کی کرسیاں، ایک بیضاوی میز، ایک نعمت خانہ، ایک الماری کتاب رکھنے کے لیے، ایک گھومنے والی الماری اور ایک تخت پوش، سب چیزیں سلیقہ سے رکھی تھیں، کمروں میں وہ قالین بھی تھے، جو ان کو شاہ افغانستان نادر شاہ مرحوم اور شہنشاہ ایران نے دیے تھے، نادر شاہ مرحوم کے دیے ہوئے قالین ویسے ہی تھے، جیسے استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندوی کو ملے تھے، علامہ اقبال کے ملبوسات میں کچھ سوٹ، کچھ اونی پائجامے، قمیصیں، شلواریں اور تولیے بھی رکھے ہوئے تھے، ان میں ایک لنگی بھی تھی، پاس ہی لوہے کے بکس اور چمڑے کے سوٹ کیس بھی رکھے ہوئے تھے، اس سامان میں پیتل کے نیچے کا ایک حقہ بھی دکھائی دیا، جس چلمچی اور لوٹے کو وہ استعمال کرتے تھے وہ بھی محفوظ کر دیے گئے ہیں، ان کا وہ قلمدان بھی رکھا تھا، جس میں دو شیشے کی دواتیں اور بیچ میں ایک ہولڈر ہے، لکڑی کی ایک سرمہ دانی بھی دکھی، ان کے کچھ جوتے اور سلیپر بھی تھیں، علامہ محمد اقبال نے مولوی محمد دین فوقؔ، مہاراجہ کشن پرشاد، مولانا گرامی، مولانا غلام مرشد، مولانا احمد علی، مولانا ظفر علی خان، سید حبیب، مولوی نور الحق، سید عبد القادر، مولانا امیر حسن، غلام رسول مہر، اور مولوی عبد الحق کو جو خطوط لکھے تھے، وہ بھی یہاں محفوظ کر دیے گئے ہیں، کلام پاک کے جو نسخے انکی تلاوت میں رہتے تھے وہ بھی تھے، ان کے

مطالعہ میں جو کتابیں رہتی تھیں، وہ بھی محفوظ کر دی گئی ہیں، یوروپین مصنفوں میں برگسان کی The Philosophy of change اور گی کی Netzche in outline and Agnonism خود نٹشے کی تین کتابیں The Twilight of the idols, The Birth of Tragedy, The joyful wisdom, براؤن کی Mystery of Space، ہوپ کی Religious spirit in the poets، بال کی اخبار الحلاج، میورڈن کی The interpretation of history اور گی کی ہٹنزنی کی Men and Memories، کردین کی The Philosophy of change اور نقادی کی Translation of Logic کارکی کتاب المقدس، مثنوی مولانا روم (چھ جلدیں) اور Arabbery تھیں، اس مجموعہ میں قصیدہ البردہ اور ایک کتاب "مسلمانوں کے افلاس کا علاج" بھی تھیں،

میں نے پروفیسر جگن ناتھ آزاد کے ساتھ بڑی دلچسپی اور انتہائی مسرت کے ساتھ علامہ اقبال کے ہاتھ کے لکھے ہوئے مسودے دیکھے، ان کی جن مثنویوں اور نظموں کے مسودے محفوظ تھے، وہ یہ ہیں (۱) اسرار خودی (۲) رموز بے خودی، شکوہ شمع و شاعر، پیام مشرق، مسافر، زبور عجم، جاوید نامہ، پیغام، مذہب، شبلی و حالی، بال جبریل، پس چہ باید کرد، پیام مشرق کے پہلے اڈیشن میں اُن کے لکھے ہوئے کچھ اشعار بھی تھے، جن کا اضافہ وہ اس کے دوسرے اڈیشن میں کرنا چاہتے تھے، ذہن میں یہ بات تھی کہ علامہ اقبال اپنے اشعار میں ترمیم نہیں کیا کرتے تھے، جو کچھ کہتے، ویسے ہی لکھ دیتے

مگر کہیں کہیں ترمیم و اضافہ بھی نظر آیا، یہ مسودے اب بہت ہی قیمتی علمی اور ادبی سرمایہ ہیں، جو بہت ہی شوق سے دیکھے جائیں گے، جاوید منزل کو حکومت نے بہت اچھے حال میں رکھا ہے، آیندہ یہ بہت ہی تاریخی عمارت سمجھی جاتی رہے گی،

جمعہ کا روز تھا، اس لئے ہم لوگ نماز کے لئے ہوٹل واپس لائے گئے، ہوٹل کے پاس ایک چھوٹی سی مسجد تھی اس سے ملحق ایک میدان تھا جس میں جانمازیں بچھی ہوئی تھیں، مگر یہ دیکھ کر دکھ ہوا کہ اس عاشق رسول شاعر، فلسفۂ اسلام کے ترجمان اور ملت کے حدی خوان کی تعلیمات اور پیغامات کو سننے کے لئے تو شاندار اجتماع تھا لیکن اس میں سے نماز جمعہ ادا کرنے والوں کی تعداد بہت ہی کم تھی، قاری محمد ظریف صاحب نے نماز پڑھائی، وہ پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ قانون کے کتب خانہ کے لائبریرین ہیں، دیکھنے میں پنجابی معلوم ہوئے، لیکن گفتگو ہوئی تو معلوم ہوا کہ ضلع مونگیر (ریاست بہار) کے رہنے والے تھے، اب پاکستانی ہیں، مولانا مناظر احسن گیلانی کے رشتہ داروں میں ہیں، نماز میں اتنی اچھی قرأت کی کہ دل خوش ہوگیا۔

اسی سہ پہر کو کانگریس کا باضابطہ افتتاح پنجاب یونیورسٹی کے شاہ فیصل ہال میں تھا، ہم لوگ وہاں لے جائے گئے، باہر طلبہ علیحدہ علیحدہ ملکوں کے نام لئے کھڑے تھے، میں علی سردار جعفری صاحب اور پروفیسر جگن ناتھ آزاد کے ساتھ ہندوستانی مندوبین کی نشت گاہ پر بیٹھ گیا، ڈائس کی آرائش قابل دید تھی، اس پر بیٹھنے والوں کو دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ یورپ یا امریکہ کے کسی جلسہ کا منظر پیش نظر ہے، پاکستان کے صدر جناب فضل الٰہی چودھری صاحب اسٹیج پر تشریف لائے، تو قاری محمد ظریف نے تلاوت کلام پاک کی، ان کی قرأت کچھ ایسی سامعہ نواز تھی کہ دل پر ایک خاص کیفیت

طاری ہوگئی، اور ساری فضا متاثر نظر آئی، پروفیسر ڈاکٹر خیرات محمد ابن رسا نے انگریزی
میں خطبۂ استقبالیہ پڑھا اس کے بعد جناب فضل الٰہی چودھری نے علامہ محمد اقبال کی ایک
قد آدم تصویر کی نقاب کشائی کی، اس تصویر میں علامہ محمد اقبال شلوار شیروانی اور ٹوپی
پہنے دکھائی دیے، ان کے پیچھے قرطبہ کا منظر تھا، اس کے بعد بیرونی مندوبین کا تعارف کرایا
گیا ہم ہندوستانی مندوبین کے نام لئے گئے، تو دیر تک حاضرین تالیاں بجاتے رہے پروفیسر
آل احمد سرور اس وقت تک نہیں پہونچ پائے تھے، دوسرے دن آئے، تعارف کے
بعد صدر پاکستان جناب فضل الٰہی چودھری نے افتتاحیہ خطبہ پڑھا، اس کے بعد
ایک پر تکلف چائے کا انتظام تھا، اس میں جناب صدر پاکستان سے خاص طور پر
ملاقات کا موقع ملا، میں نے ان کی خدمت میں مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کی دو خاص
کتابیں Civilisation اور Glory of Iqbal پیش کیں جن کو
انھوں نے شکریہ کے ساتھ قبول فرمایا، اس موقع پر ان کے سکریٹری اور اے ڈی سی اور
فوٹو گرافر انھیں گھیر کر کھڑے ہوئے تھے اسی استقبالیہ دعوت میں اپنے سفیر جناب کے۔ ایس
باجپائی سے بھی ملاقات ہوئی، وہ بڑی خوش اخلاقی سے پیش آئے، اپنے موٹر پر ہوٹل
واپس لائے، ان کے کمرے میں بڑی اچھی صحبت رہی، وہیں پاکستان کے مشہور شاعر فیض
احمد فیض صاحب بھی آگئے، جناب باجپائی اور ان کی اہلیہ نے ہم لوگوں کی بڑی خاطر کی
اسی رات کو علامہ اقبال سے متعلق جتنی کتابیں اب تک لکھی جا چکی تھیں ان کی
بھی نمائش تھی، جو بڑے سلیقہ سے سجائی گئی تھی، اس جشن کی ایک تحریر میں بیان کیا گیا
ہے کہ علامہ اقبال پر اب تک دو ہزار کتابیں لکھی جا چکی ہیں، اس لحاظ سے وہ شیکسپیر
دانتے اور رابندر ناتھ ٹیگور سے بھی آگے بڑھ گئے ہیں، اس میں مولانا عبد السلام ندوی مرحوم

کی اقبال کامل اور مولانا ابو الحسن علی ندوی کی گلوری آف اقبال بھی تھیں، اس نمائش
کو کامیاب بنانے میں جناب رفیع الدین ہاشمی پروفیسر گورنمنٹ کالج سرگودھا نے بڑی
محنت کی تھی، ان کی کتابیات اقبال، اقبال اکیڈمی لاہور سے شایع ہوئی ہے، ان کے
ساتھ ڈاکٹر محمد بشیر حسین صدر شعبہ فارسی، اورنٹیل کالج لاہور بھی بڑی سرگرمی سے شریک
رہے۔ نمایش کے بارہ میں اظہار خیال کے لئے ایک رجسٹر تھا، میں نے بھی
اپنے تاثرات اس میں درج کر دئے،

۳۰ دسمبر کو مقالات کے پڑھنے اور سننے کا سلسلہ شروع ہوا، پہلے روز تمام مندوبین
ایک ساتھ جمع ہوئے، اس اجلاس کی صدارت ڈاکٹر فریدون زند فار سفیر ایران
نے کی، ان کے شریک صدر (کو چیرمین) ڈاکٹر خیرات محمد ابن رسا وائس چانسلر پنجاب
یونیورسٹی تھے، سکریٹری کے فرائض خواجہ غلام صادق نے انجام دیئے سب پہلے ڈاکٹر
جسٹس جاوید اقبال نے اقبال اور تصوف کے موضوع پر ایسی خوش اسلوبی کے ساتھ
اپنے خیالات پیش کئے کہ دل بہت خوش ہوا، اس موضوع پر میں جو کچھ سوچ
یا لکھ سکتا تھا، اس کی بہت ہی عمدہ عکاسی اور ترجمانی ان کی تقریر میں تھی، اجلاس
کے بعد ملاقات ہوئی تو میں نے کہا کہ آپ نے بزم صوفیہ کے مصنف کے دل کی باتیں
کہدیں۔ اسی اجلاس میں پروفیسر جگن ناتھ آزاد کا مقالہ "اقبال ہز آرٹ اینڈ تھاٹ" پڑھا،
انھوں نے بہت عمدہ اور موثر انداز میں اپنے مقالہ کا خلاصہ پیش کیا، وہ اس وقت
اس برصغیر میں اقبالیات کے بڑے ماہروں میں سمجھے جاتے ہیں، اس لیے ان کا مقالہ
بہت غور سے سنا گیا، اور خوب داد دی گئی، اس کے علاوہ دوسرے مقالات کے عنوانات
اور مقالہ نگاروں کے اسمائے گرامی یہ تھے،

(۱) Medival Religiosity of Dante and The Modern Religion of Iqbal
از پروفیسر علی سنڈرو بوسانی (روم یونیورسٹی، اٹلی)

(۲) Reflections on Iqbals mosque
از ڈاکٹر باربرا شکاف (پن سلوینیا یونیورسٹی، امریکہ)

(۳) Iqbal. His Message از سید عبدالحی (ڈھاکہ یونیورسٹی)

(۴) Iqbal: A universal leader از ڈاکٹر عبدالکریم سیٹو (جاپان)

(۵) Iqbals Message از ڈاکٹر عبدالقادر کرہان (ترکی)

(۶) پروفیسر جلال متینی (ایران) نے اپنے خیالات کا اظہار ایک تقریر کے ذریعہ سے فارسی زبان میں کیا،

صبح کا یہ اجلاس ۹ بجے سے شروع ہو کر گیارہ بجے ختم ہو گیا، کافی اور چائے کے بعد دوسری نشست ہوئی اس کی صدارت پروفیسر میر حسین شاہ (افغانستان) نے کی، شریک صدر ڈاکٹر جسٹس جاوید اقبال تھے، اور سکریٹری کے فرائض جناب محمد اسمٰعیل بھٹی نے ادا کئے، اس میں حسب ذیل مقالات پڑھے گئے،

(۱) Iqbals linguistic situation از پروفیسر جوسی آرو (فن لینڈ)

(۲) Iqbal seeing our time and speaking Prophetic از پروفیسر کارل ایلوف (سویڈن)

(۳) to day faith in Iqbal, Buber and Tillich از شیلا میکڈونوف (کناڈا)،

(۴) اقبال فی مصر از ڈاکٹر محمد سعید جمال الدین (مصر)

(۵) Iqbal and Nationality از جناب جویل جلال الدین (فلپائن)

(۶) Iqbal: Poet of the East از جناب مبارک مغربی (سوڈان)

(۷) Iqbal and the third world۔ از پروفیسر کارونارتنائن (سری لنکا)

یہ اجلاس ایک بجے ختم ہوا، جس کے بعد ایک پرتکلف لنچ ہوا، شام کو لاہور میوزیم میں اقبال کو مصوری کے ذریعہ سے پیش کیا گیا، جہاں پاکستان کے مشہور مصور عبدالرحمٰن چغتائی، صادقین، اسلم کمال اور عباسی عابدی نے اقبال کے بعض اشعار کو مصور کیا تھا جن کی قدر و قیمت کا اندازہ مصوری کے ماہرین ہی کر سکتے تھے، اس کی رسم افتتاح پنجاب کے گورنر جسٹس اسلم ریاض نے کی، وہاں سے واپسی کے بعد انٹر کونٹی نینٹل ہوٹل میں رات کا کھانا ہوا جو پہلے سے بھی زیادہ پرتکلف تھا،

۲۹ دسمبر کو پھر مقالہ خوانی کا اجلاس نو بجے صبح سے شروع ہوا، اس کی صدارت روس کے ڈاکٹر سوخاچیو نے کی، اور ڈاکٹر جسٹس ایس۔ اے۔ رحمان شریک صدر ہوئے سکریٹری ڈاکٹر خالد حمید شیخ تھے، ڈاکٹر جسٹس رحمان پاکستان کے سپریم کورٹ کے چیف جسٹس رہ چکے ہیں، شاعر بھی ہیں، ان کے کلام کا مجموعہ شایع ہو چکا ہے کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں بڑے خلیق اور ملنسار ہیں، راقم سطور سے دارالمصنفین کے تعلق سے بڑی گرم جوشی سے ملے، اس اجلاس کا آغاز خود ان کے مقالہ سے ہوا جس کا عنوان تھا "اقبال اور اجتہاد" دوسرے مقالات حسب ذیل تھے،

(۱) The importance of Scientific Knowledge in Iqbal's Philosophical thoughts-

یہ مقالہ نظریہ اضافیت کے مشہور ماہر ڈاکٹر رضی الدین صدیقی نے لکھا تھا، (ڈاکٹر صاحب تقسیم سے پہلے عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد میں تھے، پھر پشاور، سندھ اور اسلام آباد کی یونیورسٹیوں کے وائس چانسلر بھی رہ چکے ہیں) (۲) Iqbal and Kashmir از جسٹس محمد یوسف صراف (چیف جسٹس مظفر آباد ہائی کورٹ) (۳) The illustrious Ancestry of Iqbal از ڈاکٹر محمد باقر (لاہور) (۴) Iqbals attitude towards Imperialism از ڈاکٹر جان مارک (چیکوسلواکیا) (۵) اقبال اور میراث اسلام۔ از ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی (کراچی یونیورسٹی) (۶) اقبال اور تقدیر امم، از ڈاکٹر محمد ریاض (اسلام آباد)، (۷) اقبال اور عارفانہ تجزیہ از ڈاکٹر وزیر آغا (لاہور)

مقالات کی کثرت کی وجہ سے ایک ہی وقت میں دو اجلاس کئے جانے لگے اس لئے ایک دوسرے کمرہ میں ۳۰ دسمبر کی صبح کا جو علیحدہ اجلاس ہوا، اس کے صدر جاپان کے ڈاکٹر عبد الکریم سیتو اور ان کے شریک میاں امیر الدین (صدر مرکزی مجلس اقبال لاہور) ہوئے، سکریٹری پروفیسر ذوالفقار علی ملک تھے، اس کی ابتدا میاں امیر الدین کے مقالہ "علامہ اقبال، چند باتیں اور چند یادیں" سے ہوئی دوسرے مقالات یہ تھے۔

(۱) اقبال اور نثر اردو۔ از جناب فرمان فتح پوری صاحب (کراچی یونیورسٹی)

(۲) اقبال ایک متکلم کی حیثیت سے از ڈاکٹر شیخ محمد ابراہیم خلیل (حیدر آباد)

(۳) Iqbals Views on Nation and Millat

از پروفیسر احمد حسن دانی (اسلام آباد یونیورسٹی) (۴) Iqbal as member of The Punjab Legislative Council از ڈاکٹر عبد الحمید (لاہور) (۵) اقبال اور پاکستان۔ از ڈاکٹر عبد السلام خورشید (لاہور) اس اجلاس میں مولانا امتیاز علی خان عرشی کا مقالہ زمان و مکان کی بحث سے متعلق علامہ اقبال کا ایک مقالہ اور ہارورڈ یونیورسٹی کی پروفیسر اینے میری شمل کا مضمون "اقبال کی شاعری میں ابلیس" بھی رکھا گیا تھا، مگر خود یہ دونوں لاہور نہ آسکے تھے۔

کافی اور چائے کے بعد ۳۰ دسمبر ہی کو دو اجلاس پھر علیحدہ علیحدہ کمروں میں ہوئے ایک کی صدارت پروفیسر جلال متینی (ایران) نے کی، ان کے شریک صدر پروفیسر میاں عبد الشکور احسن تھے، جو پنجاب یونیورسٹی میں فارسی، اور علوم مشرقی و اسلامی کے صدر رہ چکے ہیں، سکریٹری ڈاکٹر خواجہ غلام زکریا تھے، اس میں حسب ذیل مقالات پڑھے گئے۔

(۱) Iqbals philosophy of prayer از ڈاکٹر عبد الرؤف (لاہوری) (۲) Iqbals Nature of the self از مسز اختر امام (ڈھاکہ) (۳) Iqbal as a modern interpreter of Islam از جناب محمد سعید شیخ (لاہور) (۴) Some remarks on th Nietzsche Conception of Iqbal از ڈاکٹر برنڈ مینوٹل دیشر (جرمنی) (۵) Is Iqbal a pantheist از جناب بشیر احمد ڈار (لاہور) (۶) اقبال والقرآن از ڈاکٹر حسین مجیب المصری (قاہرہ) (۷) In memory of Iqbal

از۔ ڈاکٹر عبدالرزاق محی الدین بغدادی) (۸) علامہ اقبال اور ان کے قارئین از مجتبیٰ حسین (کوئٹہ)

دوسرے گروہ کے اجلاس کی صدارت ترکی کے پروفیسر ڈاکٹر نزہت یال سن تاس نے کی شریک صدر پروفیسر عبادت بریلوی تھے، سکریٹری، جناب علی عباس ہوتے، اس میں یہ مقالے پڑھے گئے۔

(۱) علامہ اقبال اور عظمت آدم از۔ پروفیسر ڈاکٹر عبادت بریلوی (لاہور)

(۲) مکاتیب اقبال کا ادبی جائزہ، از۔ جناب آفاق صدیقی (میرپور خاص)

(۳) اقبال اور احترام آدمیت، از۔ ڈاکٹر آغا یمین خان (لاہور) (۴) The main spring of Iqbal's Lifework از۔ محمد ہادی حسین (کراچی) (۵) Rumi and Iqbal از۔ محمد اونڈر (جرمنی) (۶) Iqbal and yeats از۔ مسز برنڈا یاسین۔

یہ دونوں اجلاس ختم ہوئے، تو لنچ ہوا سہ پہر میں لاہور کے شہریوں کی طرف سے شالیمار باغ میں عصرانہ تھا، گزشتہ اشاعت میں ذکر ہو چکا ہے، کہ اسی وقت ڈاکٹر سید عبداللہ نے جناب نذیر نیازی کو ان کی خدمات کے صلہ میں سپاسنامہ اور ایک تھیلی پیش کرنے کی تقریب رکھی تھی، پروفیسر جگن ناتھ آزاد اور مجھ سے انھوں نے بہت اصرار کیا کہ ہم دونوں اس میں ضرور شریک ہوں، شالیمار باغ کی تقریب کی وجہ سے دشواری محسوس ہو رہی تھی مگر ہم دونوں کی جناب محمد یعقوب ہاشمی ممبر پبلک سروس کمیشن کی عنایت سے یہ مشکل آسان ہو گئی اور ہم لوگ آسانی سے دونوں تقریبوں میں شریک ہو سکے ہاشمی صاحب

بڑا اچھا ادبی ذوق رکھتے ہیں، ہندوستان اور پاکستان کے شعراء کے اشعار ان کی نوک زبان پر ہیں، ڈاکٹر عبداللہ سے رخصت ہو کر ہم لوگ شالیمار پہونچے، اس باغ کے تزک و احتشام اور آرائش و زیبائش کو دیکھ کر تیموری بادشاہوں کی شان و شوکت اور زیب و زینت کی تصویر نگاہوں کے سامنے آگئی اور میں عالم خیال میں، اپنی کتاب ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے" کی ورق گردانی کرنے لگا۔ اس باغ نے مغل سلاطین کی سیر و تفریح کے کیسے شاندار منظر دیکھے ہوں گے، آج تیموریوں کا جاہ و جلال قصۂ پارینہ ہو چکا ہے، غنیمت ہے کہ پاکستانی حکمران ان کی یادگاروں کی حفاظت کر رہے ہیں، اور ان کی رعنائی و زیبائی میں اضافہ کر رہے ہیں۔

شالیمار سے واپسی کے بعد علامہ اقبال کی لڑکی منیرہ صلاح الدین صاحبہ کے دولت کدہ پر ڈنر تھا، مندوبین کے علاوہ شہر کے دوسرے معززین بھی بڑی تعداد میں موجود تھے، ہم لوگ پہونچے تو سارا مکان اور شامیانہ بقعۂ نور نظر آیا، نشست کا انتظام بہترین اور کھانے ایک سے ایک بڑھکر تھے، اس ڈنر کے ساتھ ایک محفلِ سماع بھی تھی، جس میں اقبال کی غزلیں گائی جا رہی تھیں، پروفیسر آل احمد سرور اس دن آ گئے تھے، اور ڈنر میں شریک ہوئے، منیرہ صاحبہ اپنے شوہر جناب صلاح الدین اور اپنے بھائی جاوید اقبال صاحب کے ساتھ مہمانوں کی پذیرائی بڑی خندہ پیشانی سے کر رہی تھیں، منیرہ صاحبہ اور جاوید اقبال صاحب دونوں پروفیسر جگن ناتھ آزاد سے بڑے تپاک سے ملے، آزاد نے کہا کہ اقبال اور ان کی اولاد کا گھر تو میرا مرکزِ عقیدت اور کعبۂ مقصود ہے، جناب جاوید اقبال نے کہا میں تو آپ کو اپنا بھائی سمجھتا ہوں، منیرہ صاحبہ نے جاوید اقبال صاحب سے مخاطب ہو کر کہا کہ جب آزاد صاحب آپ کے بھائی ہیں تو وہ میرے بھائی بھی ہوئے، پھر آزاد صاحب سے

کہا کہ ایک روز ہم تینوں بھائی بہن مل کر اس قسم کے ہنگامے سے الگ کھانا کھائیں، دوسرے دن آزاد منیرہ صاحبہ کے مہمان خصوصی ہوئے۔ اور اُن کے اور جاوید اقبال صاحب کے ساتھ کھانا کھایا، یہ پروفیسر آزاد کا بہت بڑا اعزاز تھا

میں ہندوستان سے چلا تھا تو نزلہ اور کھانسی میں مبتلا تھا، سفر اور ان تقریبات کی مشغولیتوں سے اور خستہ ہوگیا، ۵ر دسمبر کو مقالہ خوانی کا آغاز ہوا تو اطلاع ملی کہ ایک اجلاس کی صدارت مجھے بھی کرنی ہے، سردار محمد اقبال خاں شریک صدر (کو چیرمین) مقرر ہوئے جو پنجاب یونیورسٹی میں لا کالج کے پرنسپل ہیں، اور اپنی قابلیت کی وجہ سے بڑی عزت کی نظروں سے دیکھے جاتے ہیں، سکریٹری جناب عبدالخالق صاحب تھے جو پنجاب یونیورسٹی میں شعبۂ فلسفہ کے پروفیسر ہیں، اس اجلاس میں زیادہ تر بیرونی مندوبین کے مقالے پڑھے گئے، جو حسب ذیل تھے، (۱) - Image ond symbol in Iqbal

از مسٹر اسکال موسکی (بلجیم)، Persian quatrains

(۲) محمد اقبال، از ڈاکٹر عبدہ ودود شالبی (مصر)، (۳) - Reflechwns on

ڈاکٹر محمد سولٹی ڈیوٹس (۴)، (۳) - Khugr-i-Rah - Iqbal in The

(۵)، از محمد رحیم الہام - heart - Iqbal idea about The

از جے۔ سی۔ برجل (سوئزرلینڈ) - True nature of poetry

(۶) عبدالمعین الموفی (دمشق) نے بھی اقبال پر اپنے خیالات کا اظہار کیا، دو اور مقالے پڑھے نہ جا سکے،

جب یہ اجلاس ختم ہوا، تو مجھے صدر کی حیثیت سے اپنے خیالات پیش کرنے کے لئے کہا گیا میں نے عرض کیا کہ مجھکو یہ صدارت دے کر ہندوستان کے ساتھ پاکستان کی طرف سے جذبۂ خیر سگالی

اور علامہ شبلیؒ اور مولانا سید سلیمان ندویؒ کے ادارہ دارالمصنفین کی قدردانی کا اظہار کیا گیا ہے، کی گئی ہے، جس کے لئے میں تہِ دل سے شکر گذار ہوں، میں نے پھر کہا کہ ہندوستان میں بھی کچھ دنوں پہلے اقبال پر ایک بین الاقوامی سمینار منعقد ہوا تھا، ممکن ہے، اس کا کانگریس کے برابر وہ شاندار و پرشکوہ اور دلآویز و دلنواز نہ ہو لیکن میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہ پورے طور پر شاعر مشرق کی شان، رتبہ اور وقار کے مطابق تھا، پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے بڑے سلیقہ سے خوبصورتی کے ساتھ اس میں اس فلسفی شاعر کی زندگی کی نمائش تصویروں اور تحریروں کے ذریعہ سے کی تھی جو دیکھنے کے لائق تھی، یہاں سے جو پاکستانی وفد گیا تھا وہ بھی اس کو دیکھ کر محظوظ ہوا، پھر ہمارے وزیر مسٹر ایل۔ کے۔ اڈوانی نے اس موقع پر انگریزی میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ ہم لوگوں کو امید ہے اقبال ہندوستان اور پاکستان کے درمیان خیر سگالی کے جذبات پیدا کرنے کا موثر ذریعہ ثابت ہوں گے، ہم لوگ اس پر آمین کہتے ہیں

شریک صدر سردار محمد اقبال خاں آخر میں بولنے کے لئے کھڑے ہوئے، تو مقالہ نگاروں کے مقالات پر مختصر طریقے پر پرمغز تبصرے کئے، پھر میری تقریر کا ذکر تحسین آمیز طریقہ سے کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستان کی طرف سے خیر سگالی کے جذبہ میں پاکستان برابر کا شریک ہے، ان شاء اللہ اقبال نہ صرف ہندوستان و پاکستان بلکہ انسان اور انسان کے درمیان خیر اندیشی کا جذبہ پیدا کرنے میں موثر ثابت ہوں گے،

(باقی)

اقبال کامل

از مولانا عبدالسلام ندویؒ

ضخامت: ۴۰۰ صفحے، قیمت:۔ ۵۰-۱۲

ارادت خان واضح کی ایک تصنیف

کلمات

از پروفیسر ڈاکٹر سید عبدالرحیم صدر شعبۂ عربی، ناگپور مہاودیالیہ، ناگپور

میر مبارک اللہ ارادت خان واضحؔ (۱۰۵۸ھ - ۱۱۲۸ھ) اورنگ زیب عالم گیر کے عہد کے نامور شعراء اور ممتاز امراء میں ہے، واضحؔ کی شعری ونثری دونوں ہی کاوشیں بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں، اس مضمون میں ان کی ایک تصنیف "تاریخ ارادت خان" کے نام کے متعلق بعض امور کی وضاحت اور ایک غلطی کا ازالہ مقصود ہے۔

عموماً یہ کتاب اسی نام سے موسوم ہے[1]

ریو[2] اور ایتھے کے سامنے جو نسخے تھے، ان کے سرورق پر "مقتل السلاطین تحریر ہے[3] سالارجنگ میوزیم لائبریری کے مخطوطے پر "کتاب بیاض ارادت خان واضح"[4] اور بانکی پور لائبریری کے نسخے پر "تاریخ مبارکی"[5] درج ہے۔

اس کتاب کے دو ترجمے چھپ چکے ہیں، ایک جوناتھن اسکاٹ کا انگریزی

[1] ملاحظہ ہو اسٹوری ص ۶۰۲، سالارجنگ میوزیم لائبریری کیٹلاگ ج ا ص ۳۵۳، مغل ببلیوگرافی ص ۱۵۰، ایلیٹ اینڈ ڈاسن ج ۷ ص ۵۳۴، اورینٹل پبلک لائبریری بانکی پور کیٹلاگ ج ۷ ص ۸۸ [2] ریو ص ۹۳۸ [3] ایتھے ص ۲۶۴، [4] مخطوطہ نمبر ۳۴۴ [5] ج ۷ ص ۹۰

ترجمہ Memoirs of Eradat Khan کے نام سے شایع ہوا۔[1] دوسرا اردو ترجمہ سوانح عمری ارادت خان واضح کے نام سے مولوی سید اشرف شمسی حیدرآبادی کے قلم سے ہے۔[2]

واضح کی اس تصنیف کا بنظر مطالعہ کرنے سے تو یہ بات صاف طور پر واضح ہوجاتی ہے، کہ اس کتاب کا نام خود واضح نے "کلمات" رکھا ہے، داخلی شواہد سے صراحت کے ساتھ یہی ظاہر ہوتا ہے، اس کے علاوہ سب نام اضافی اور الحاقی معلوم ہوتے ہیں

صوفیانہ مسائل اور اصطلاحات کی تشریح میں واضح کی "کلمات عالیات" کے نام سے ایک مبسوط تصنیف ہے، اس کے بعد اس نے "کلمات" لکھنے کا ارادہ کیا، اور اول الذکر ہی کی رعایت سے یہ نام رکھا، اس کی تائید میں چند اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں۔ کتاب کے دیباچہ میں وہ لکھتا ہے۔

چون "کلمات عالیات" بانجام رسید چنانچہ	جب کلمات عالیات کی تصنیف کا کام
بعض کیفیات در خاتمہ آن	مکمل ہوگیا، جس کے آخر میں ان کیفیتوں
ثبت افتادہ محظور گردید کہ در زمان	کا ذکر ہے تحریر کے وقت جو خیال میں
تحریر این حالاتے کہ بر خود گذشتہ بطریق	آئی تھیں، یہ حالات جو اپنے اوپر گذرے
اجمال قلم بند نمایم ہمانا درین "کلمات"	اس کتاب "کلمات" اور دوسری کتابوں
در تصانیف دیگر بنظر افتادہ باشد[3]	میں اجمالاً قلمبند کیے گئے ہیں۔

اسی دیباچہ کے آخر میں لکھتے ہیں،

[1] مطبوعہ لندن ۱۸۷۰ء، اس کی تلخیص ایچ ام ایلیٹ نے شائع کی لندن ۱۸۷۱ء ص ۵۶۴ - ۵۳۲ [2] مطبوعہ حیدرآباد ۱۳۱۱ھ [3] سالارجنگ میوزیم مخطوطہ ۳۴۴ ص ۱

از زمانے کہ این "کلمات" بہمان
عبارتے کہ لایق آن مطالب تحریر آمد
آنچہ دربین رو داد از احوال خود نقل
نمودیم امید از مطالعہ کنندگان آنست
کہ انصاف از دست ندہند[1]

جس زمانہ مین کہ یہ کلمات اس عبارت
اور پیرایہ میں لکھی گئی، جو اس کے مطالب
کے لحاظ سے موزوں تھے، اپنے حالات کے
سلسلہ میں اس میں جو کچھ نقل ہوا ہے
انکے بارہ مین قارئین انصاف کی نظر
سے مطالعہ کرین گے۔

کتاب کی ابتدائی سطور ملاحظہ ہوں

"ابتدای تحریر "کلمات" چون در اتیاوہ
گڑھ اودونی واقع شدہ کہ سنہ یکہزار
دیکصد دیازدہ بودہ ازان باز تا انجام
تحریر "کلمات" کہ یکہزار دیکصد و
بیست وچہار است ہمہ درین بین
رودادہ وحالاتے کہ بر خود گذشتہ
بتحریر درمی آید[2]

جب "کلمات" کا آغاز ۱۱۱۲ھ میں
اتیاوہ گڑھ اودونی میں کیا گیا اسوقت
سے ۱۱۲۴ھ میں اس کے اختتام کے
وقت تک اپنے اوپر جو حالات وکیفیات
طاری ہوئے ان کو اس کے اندر
قلم بند کیا گیا ہے

آخری صفحہ پر تحریر ہے۔

"ابتدای تحریر "کلمات" عالیات
چون در ادونی در سنہ یکہزار ویکصد
دیازدہ بود از ان باز حتی الیوم کہ سنہ

کلمات" عالیات" کی تصنیف وتحریر
جب اودونی میں ۱۱۱۲ھ مین کیگئی
تھی اس کے بعد سے آج تک ۱۱۳۶ھ مین

[1] سالار جنگ میوزیم مخطوطہ ۳۴۴ ص ۳ [2] ایضاً

یکہزار دیکصد وبیست وشش است
تحریر "کلمات" با تمام رسید حالاتے کہ
دربین بر خود گذشتہ بطریق اجمال
برای یادگار بتحریر آمد وچون این در
محل خود در ہمین خاتمہ مذکور است
غرض تحریر بادشاہنامہ نیست کہ
احوال امراء وقضایای سلطنت
باید نوشت[1] دو کلمات "سرگذشت
حالات خود است بس الحمد للہ الذی
بعزتہ وجلالہ تتم الصالحات"[2]

جبکہ کلمات کی تالیف تکمیل کو پہنچ گئی
ہے، جو حالات اپنے کو پیش آئے ان کو
بطور یادگار اختصار سے تحریر کر دیا
گیا ہے، یہ بات اپنے مقام پر بالکل
خاتمہ میں مذکور ہے اس کا مقصد بادشاہ
نامہ نہیں ہے، جس میں امراء کے حالات
اور امور سلطنت تحریر کئے جاتے ہیں،
دو کلمے صرف اپنی سرگذشت اور
حالات میں لکھے ہیں سارا شکر اس اللہ
کے لیے ہے، جس کی بدولت نیک کام

"کلمات" میں واضح نے اورنگ زیب کے دور حکومت کے آخری ایام سے فرخ سیر کی
تخت نشینی یعنی ۱۱۲۵ھ تک کے حالات درج کیے ہیں۔ اس مختصر سی مدت میں کئی مغل
شہزادوں کے سرتن سے جدا کیے گئے، اس خونچکاں داستان کو "مقتل السلاطین" کے نام سے
موسوم کیا جانا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے، اسی طرح واضح کے نام میر مبارک اللہ کی رعایت
سے "تاریخ مبارکی" کے نام سے معنون کیا جانا بھی قرین قیاس ہے، اسی طرح مصنف کی
تحریر "حالاتے کہ بر خود گذشتہ" کے تحت اسکاٹ کا Memoirs لکھنا اور مولوی سید اشرف
شمسی کا سوانح عمری ارادت خان تحریر کرنا سب ہی نام موزوں معلوم ہوتے ہین لیکن چونکہ خود واضح کے قلم سے بار بار
اس تصنیف کی وضاحت "کلمات" کے عنوان سے ملتی ہے اسلئے کوئی وجہ نہیں کہ "کلمات" کے علاوہ تمام عنوانات کو
اضافی نہ سمجھا جائے۔

[1] دو کلمہ "سو کلمات" او "کلمات عالیات" مراد لئے جاسکتے ہیں موخرالذکر تصنیف میں بھی واضح کی زندگی کے چند واقعات ملتے ہیں [2] مخطوطہ ص ۱۴۵

ادبیات

غزل

از جناب بسمل شاہجہاں پوری

بسمل یہ دن گذار دے شان خودی کے ساتھ
کم ظرف الجھ رہے ہیں تری بے کسی کے ساتھ

واعظ نہ چھیڑ کر مری بادہ کشی کے ساتھ
رحمت کو ربط خاص ہو تر دامنی کے ساتھ

اچھا نہیں دلوں میں جو باقی رہے غبار
ترک تعلقات بھی ہو تو خوشی کے ساتھ

میرا بھی ظرف دیکھ تعصب پرست دوست
صدیاں گذار دی ہیں تری کافری کے ساتھ

اے دوست ہر فریب مسلسل ترا قبول
لیکن یہ کس کے ساتھ مری سادگی کے ساتھ

دیکھو آج کل دوست ہیں اکثر زمانہ ساز
بسمل بس اب نہ دوستی کیجو کسی کے ساتھ

غزل

از جناب نعیم الدین احسن دریابادی مرحوم

کرامت بندگی میں کیسی خلاق جہاں رکھ دی
ترا جلوہ نظر آیا جبیں میں نے جہاں رکھ دی

میں اُن کے سامنے حال دل ناکام کیا کہتا
فقط اک آہ نے دہرا کے ساری داستاں رکھ دی

دفا ناآشناؤں میں بھی چرچا جس کا رہتا ہو
دفا کی میں نے وہ بنیاد زیر آسماں رکھ دی

تمنا تھی کہ ظاہر ہو نہ اُن پر راز الفت کا
مگر اشکوں نے میرو کر کے شرح داستاں رکھ دی

رہ الفت میں مٹ جانا بھی تکمیل محبت ہو
کہ معیار محبت نے یہ قید امتحاں رکھ دی

نمونہ بن گئی صناع کی قدرت کا اے احسن
سلیقہ سے یہ خالق نے جو مشت بھی جہاں رکھ دی

مطبوعات جدیدہ

صیانۃ الحدیث ۔ مرتبہ ۔ مولانا عبدالرؤف رحمانی جھنڈانگری تقطیع خورد کاغذ معمولی کتابت وطباعت اچھی صفحات ۲۰۰ قیمت چھ روپیے پتہ ۔ از مصنف کیرآف خان کلاتھ ہاؤس ، ڈاکخانہ رام دت گنج ، ضلع بستی ۔

تقریباً ستر اسّی برس سے مستشرقین اور منکرین حدیث احادیث نبوی کے خلاف پروپگنڈہ کر رہے ہیں ، علماء اسلام نے اس کے ایسے تشفی بخش جواب دیئے ہیں کہ مخالفین لاجواب ہو گئے ہیں اس سلسلہ میں علامہ شبلی ، مولانا سید سلیمان ندوی ، مولانا شاہ معین الدین ، مولانا عبدالسلام ، ڈاکٹر زبیر صدیقی ، ڈاکٹر مصطفےٰ سباعی وغیرہ کے عالمانہ اور مدلل مضامین خاص طور سے قابل ذکر ہیں پیش نظر کتاب بھی اسی سلسلہ کی کڑی ہے ، مولانا عبدالرؤف صاحب نے اس میں احادیث کی نقل و روایت اور تحریر و کتابت میں محدثین کرام کی احتیاط محنت اور کد و کاوش کی تفصیل بیان کی ہے ، اس سلسلہ میں تابعین و تبع تابعین کے عہد سے تیسری صدی ہجری تک کے مشہور محدثین کے حفظ و ضبط ، عدالت و دیانت ، تقدس و تقوی کے موثر واقعات اور چند اکابر محدثین کے مختصر سوانح حیات و خدمات حدیث بھی قلمبند کئے گئے ہیں ، مصنف نے امہات کتب حدیث کا بھی جائزہ لیا ہے ، اور بتایا ہے کہ وہ اس قدر صحت و تحقیق سے مرتب کی گئی ہیں کہ دنیا کی تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں مل سکتی ہے اس لئے منکرین حدیث کے شبہات کی کوئی حقیقت نہیں ہے ،

مفتی صدر الدین آزردہ ۔ مرتبہ۔ مولانا عبدالرحمن پرواز اصلاحی متوسط تقطیع کاغذ کتابت وطباعت عمدہ صفحات ۲۲۴ مجلد قیمت بارہ روپیے ۔ پتہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دہلی ۔

مغلیہ سلطنت کے دور زوال میں، جو فضلاء اور ارباب کمال گذرے ہیں، ان میں مفتی صدر الدین آزردہ کی شخصیت بعض حیثیتوں سے بڑی جامع تھی، لیکن ابھی تک ان پر کوئی مستقل کتاب نہیں لکھی گئی تھی، زیر نظر کتاب اسی کمی کو پورا کرنے کے لیے لکھی گئی ہے، جو تیرہ ابواب پر مشتمل ہے شروع کے چار ابواب میں مفتی صدر الدین آزردہ کے خاندانی حالات تعلیم و تربیت، درس و تدریس اور صدر الصدور کے منصب پر فائز ہونے کا ذکر کیا گیا ہے اور ان کے فضل و کمال کے متعلق معاصرین کی شہادتیں نقل کی گئی ہیں، پھر چند ابواب میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ان کی کوششوں، قومی و مذہبی خدمات، مشہور تلامذہ اور تصنیفات کا ذکر ہے، آخر کے ابواب میں آزردہ کی فارسی وعربی تحریروں کے اقتباسات اور اردو، فارسی اور عربی کلام کے نمونے درج کئے گئے ہیں، اور ان کے اردو وفارسی کلام کی اہم خصوصیتیں دکھائی گئی ہیں، لائق مصنف نے آزردہ کی بعض تصنیفات کے تعارف میں بڑی دیدہ ریزی سے کام لیا ہے، اس ضمن میں ان کے بعض علمی خیالات اور فقہی آراء کی مدلل وضاحت بھی کی ہے کتاب مصنف کی جستجو و محنت کا نتیجہ اور اردو کے سوانحی ذخیرہ میں ایک اچھا اضافہ ہے، مصنف نے عربی وفارسی عبارتوں کا ترجمہ کر دیا ہے، لیکن یہ کہیں کہیں چھوٹ بھی گیا ہے،

مراٹھی ادب کا مطالعہ ۔ مرتبہ محمد یونس اگاسکر جیبی متوسط تقطیع، کاغذ کتابت وطباعت اچھی، .... مجلد مع گردپوش قیمت دس روپئے پتے (۱) مکتبہ جامعہ پرنسس بلڈنگ بمبئی ڈاکٹر اقبال چوک بمبئی ۳ (۲) مکتبۂ نقش کوکن، ۴۴ چیل روڈ، ایسٹ ڈونگری بمبئی ۴۰۰۰۰۹

مہاراشٹر کے نوجوان ادیب وصحافی جناب یونس اگاسکر کو اردو اور مراٹھی دونوں سے اچھی واقفیت ہے، انھوں نے مراٹھی زبان وادب کے متعلق اردو میں معلوماتی مضامین بھی لکھے ہیں، اور مراٹھی نظموں، افسانوں اور ڈراموں کے اردو ترجمے بھی کئے ہیں، یہ کتاب ان کے اسی قسم کے منتخب مضامین پر مشتمل ہے، جنھیں لائق مرتب نے بڑی خوش سلیقگی کے ساتھ جمع کر دیا ہے، مضامین مفید دلچسپ اور پر از معلومات ہیں، اس میں مراٹھی نظم ونثر کے مختلف اصناف کا جائزہ لیکر ان کی قدر وقیمت واضح کی گئی ہے، اور مراٹھی کی مذہبی، اخلاقی، رزمیہ اور عشقیہ شاعری، ناولوں اور ڈراموں کے علاوہ ان ترجموں کا بھی ذکر کیا گیا ہے جو دوسری زبانوں سے مراٹھی میں کئے گئے ہیں غالباً اردو میں یہ اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے، اس سے اردو خوان طبقہ کو مراٹھی زبان کے ادب سے واقفیت ہو جائے گی،

تلاش وتاثر ۔ مرتبہ، جناب عبد القوی دسنوی تقطیع خورد و متوسط کاغذ کتابت وطباعت بہتر

یہ کتاب اٹھارہ مضامین کا مجموعہ ہے، شروع کے تین مضامین مرزا غالب مرحوم کے متعلق ہیں، ڈاکٹر اقبال اور مولانا ابو الکلام آزاد کے متعلق دو دو اور مولانا حسرت موہانی کے متعلق ایک مضمون ہے ایک مضمون میں اردو صحافت سے متعلق ایک پاکستانی کتاب پر ریویو کیا گیا ہے، آخر کے نو مضامین میں مصنف نے مختلف اشخاص کے بارہ میں اپنے دلچسپ تاثرات ومشاہدات قلمبند کئے ہیں ان میں سے تین نجیب اشرف ندوی، بشیر الحق دسنوی اور سعید رضا ان کے ہم وطن اور عزیز ہیں اور تین ملا سجاد حسین، محمد یوسف قیصر اور رام عرفان کا تعلق بھوپال سے ہے، جہاں مصنف اس وقت مقیم ہیں، آخری مضمون میں مالک رام، علی جواد زیدی

اور سجاد ظہیر مرحوم کے بھوپال میں چند روزہ قیام کی دلچسپ روداد تحریر کی گئی ہے، یہ سب مضامین
مختلف رسالوں میں چھپ چکے ہیں، اور بعض مصنف کی مطبوعہ کتابوں میں بھی شامل ہیں لیکن
مجموعہ کی اشاعت کی حیثیت تند کر رکی ہے، غالباً کتابت کی غلطی سے ایک جگہ بلوغ المرام
کو بلاغ المرام لکھ گیا دیا ہے۔

اقبالیات ۔ مرتبہ جناب عبدالقوی دسنوی تقطیع متوسط

یہ کتاب بھی دسنوی صاحب نے لکھی ہے، یہ اقبال کے متعلق اب تک کی ہندوستانی مطبوعہ
مضامین، تحریروں اور یونیورسٹیوں کے تحقیقی مقالوں کا اشاریہ ہے، اس کے ساتھ اقبال
پر پاکستانی اہل قلم نے ہندوستانی رسالوں میں اور ہندوستانی اہل قلم نے پاکستانی رسالوں
میں جو مضامین لکھے ہیں، ان کی فہرست بھی آگئی ہے، امید ہے کہ اس مختصر کتاب سے
اقبال پر کام کرنے والوں کو بڑی مدد ملے گی۔

احکام التعزیت ۔ اس کتابچہ میں مسلمان کے آخری مراسم یعنی بیماری، موت
میت کے غسل، تجہیز و تکفین، نماز جنازہ، قبر اور ایصال ثواب وغیرہ کے شرعی احکام
بیان کئے گئے ہیں، اس کے مصنف مولوی حاجی عین الحق اعظمی دینی و ملی خدمت
کا ولولہ رکھتے ہیں، اور اللہ نے ان کو فراغت بھی عطا کی ہے، یہ رسالہ مصنف کو
نیو لائٹ ٹیزی جاج متو کانپور کے پتہ پر خط لکھ کر مفت حاصل کیا جا سکتا ہے، مگر
عربی عبارتوں میں اعراب کی غلطیاں بہت ہیں، "ض"

تعمیر حیات ۔ مولانا سید ابوالحسن علی صاحب کی نگرانی و سرپرستی میں مہینہ میں دوبار
نکلتا ہے۔ قیمت۔ سالانہ بارہ روپیے

پتہ پوسٹ بکس نمبر ۹۳ ندوہ لکھنؤ

جلد ۱۲۱ ماہ ربیع الاول ۱۳۹۸ھ مطابق ماہ مارچ ۱۹۷۸ء عدد ۳

مضامین